کہانی ہم سب کی

عبداللہ امتیاز احمد

کہانی ، ہم سب کی!
عبداللہ امتیاز احمد

(کہانی ہم سب کی)

عبداللہ امتیاز احمد

عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ۹۵

نام کتاب : دلیل

مصنف : عبداللہ امتیاز احمد

مطبع : نیو پرنٹ سینٹر، دہلی

سرورق : ڈاکٹر جنید مسعودی/امتیاز

ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

DALEEL (The Story)
by **Abdullah Imtiyaz Ahmad**
Follow at Twitter@MimtiyazA
Edition: 2020 ₹200/-

ملنے کے پتے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی-6	011-23260668
کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی	011-23276526
راعی بک ڈپو، 734، اولڈ کٹرہ، الہ آباد	+91 7905454042
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	+91 9358251117
بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ-4	+91 9304888739
کتاب دار، ممبئی	+91 9869321477
ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدر آباد	+91 9246271637
مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد	+91 9325203227
عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ	+91 9433050634
قاسمی کتب خانہ، جموں توی، کشمیر	+91 9797352280
امرین بک ایجنسی، احمد آباد، گجرات	+91 8401010786

arshia publications
-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)
Mob: +91 9971775969, +919899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

انتساب:

دانائے راز، حکیم الامت مرشدی علامہ محمد اقبالؒ

شیر سیرینکا سیدی عمر المختارؒ

حبیبی الحاج ملک الشہباز (مالکم ایکس)

پاکباز مسلمان نوجوانوں

اور آپ .... کے نام!

"منشورامت" کی ان آیت مبارکہ کے ساتھ:

اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ

بِسمِ اللّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ
عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِىْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ
الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ
وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾ قَالُوْا
تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ
تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾ قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّىْ
وَحُزْنِىْۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾
يٰبَنِىَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا
تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ
اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

(یوسف)

یعقوب (علیہ السلام) فرمانے لگے بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک بات بنالی ہے سو صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہو گا (مجھ) کو اللہ سے امید ہے کہ ان سب کو مجھ تک پہنچا دے گا (کیونکہ) وہ خوب واقف ہے بڑی حکمت والا ہے۔(83) اور ان سے دوسری طرف رخ کر لیا اور کہنے لگے ہائے یوسف (علیہ السلام) افسوس اور غم سے (روتے روتے) ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور (غم سے جی ہی جی میں) گھٹا کرتے تھے۔(84) بیٹے کہنے لگے بہ خدا (معلوم ہوتا ہے) تم سدا کے سدا یوسف (علیہ السلام) کی یادگاری میں لگے رہو گے یہاں تک کہ گھل گھل کر دم بلب ہو جاؤ گے یا یہ کہ بالکل مر ہی جاؤ۔ (85) یعقوب (علیہ السلام) نے فرمایا کہ میں تو اپنے رنج و غم کی صرف اللہ سے شکایت کرتا ہوں اور اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ (86) اے میرے بیٹو جاؤ اور یوسف (علیہ السلام) اور ان کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو بے شک اللہ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔(87)

(سورۃ یوسف) ترجمہ: مولانا اشرف علی تھانویؒ

”اس کتاب میں شامل کہانیوں میں، ان کے کردار، مقامات اور واقعات فرضی ہیں،
جن سے کسی بھی قسم کی مطابقت محض ایک اتفاقی امر ہو سکتا ہے۔
مصنف اور ناشر اس مطابقت کے لیے ذمے دار نہیں ہیں۔“

تحمید:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

○○○○
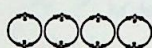
توصیف:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝

○○○○

تشکیر:

والدین ، بہنیں، بھائی(فردوس ، عرفان)استاذِ مکرم پروفیسر منصور احمد منصور، پروفیسر گلزار احمد پڈر، سکندر ارشاد، ڈاکٹر فاروق احمد، ڈاکٹر شاکر علی صدیقی، ڈاکٹر عرفان عالم، ڈاکٹر جنید مسعودی، ڈاکٹر مدثر اکبر شاہ، ڈاکٹر قاسم محمود احمد، شآد سجاد، دلربا بشیر، فریدؔہ بانو، افروزہ بانو---

دل کے ٹکڑے

جگر لخت لخت

یہ دلیل میں نے 2009ء / 1430ھ میں لکھنی شروع کی تھی۔ 2013ء / 1434ھ میں مکمل ہوئی تھی؛ پر بعض وجوہ کی بنا پر شائع نہ کر سکا۔ دلیل عربی، فارسی، اردو اور کشمیری زبان کا لفظ ہے۔ لغوی اعتبار سے عربی، فارسی اور اردو تین زبانوں میں اس لفظ کو بمعنی حجت و برہان استعمال کیا جاتا ہے۔ کشمیری زبان میں صنفی اعتبار سے یہ اردو داستان کی مترادف ہے۔ کشمیر اور کشمیری میں دلیل کے دو تصور رائج ہیں۔ پہلا: بچپن کے زمانے، بالخصوص سردیوں کے موسم میں ہم اپنے دادا، دادی، ابو یا امی کے گرد جمع ہو کر کہانیاں سنا کرتے تھے، جسے دلیل کہتے تھے۔ دوسرا: ریڈیو سے ہفتہ وار اس کو نشر کیا جاتا تھا۔ داستان گو / دلیل نگار کہانی کو پہلے نثر میں بیان کرتا اور بیچ بیچ میں کچھ اشعار ترنم کے ساتھ مسلسل گاتا، جسے کہانی کا اہم حصہ سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اس میں دلیل کے اسی انداز کو اختیار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک دہائی میں جس انتشار اور تضاد سے ہماری نسل گزری ہے اس کی وساطت سے اس کو عملاً برتنے میں مدد ملی ہے۔ نیز میں نے اس میں وقت کے بہاؤ کو منفرد انداز سے برتا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کے زمانی بُعد کو پاٹ کر انہیں صرف ایک تسلسل بنایا ہے۔ کشمیری مسلم کلچر کی بازیافت کی بنا پر اس کو دلیل کہنا میرا شعوری فعل ہے۔ اس لئے بہت

سے واقعات جو آپ کو زائد معلوم ہوں گے وہ کسی نہ کسی طور پر اسی بازیافت سے جڑے ہوئے ہیں۔

اعلیٰ مقاصد، اپنی قوم یا امتِ مسلمہ کی سربلندی کے لئے کچھ ہستیوں نے کتنی عظیم قربانیاں دیں ہیں۔ جن کا تصور بھی مشکل معلوم ہوتا ہے اور شمار بھی۔ ان میں سب سے بڑی قربانی میرے نزدیک ایسی محبت کے باوجود بھی جدائی ہے۔......... اس طرح کی ہزاروں کہانیاں ہمارے اس پر خطر دور کے سینے میں مدفون ہیں۔ آسیہ اور عبدالہادی دنیا سے متعارف ہو رہے ہیں۔ ان کی کہانی سنی جا رہی ہے۔ ان کے جذبات واحساسات سے لوگ واقف ہو کر ان کے دکھ، درد میں شریک ہو رہے ہیں۔ نہ جانے آسیہ اور عبدالہادی کی طرح ایسے کتنے عظیم انسان ہیں جنھوں نے ان سے بڑھ کر بھی قربانیاں دی ہوں گیں اور دے رہے ہیں؛ لیکن ان کو کوئی راز دار کوئی قلم کار میسر نہ آسکا! وہ کسی سے بیان بھی نہ کر پائے! آہ ان کی کہانی، ان کے ارمان، ان کے خواب ان کے سینوں میں ہی دفن ہو کے رہ گئے۔ وہ کتنے معزز و مخلص تھے کہ اپنی یادوں کے زخم بھی ہمارے لئے نہیں چھوڑے۔ میرا دل ان کے دردِ جدائی کے نغموں سے لبریز ہو کر اندر ہی اندر غم کے ساز گنگنا رہا ہے۔

مجھے امید ہے کہ آپ اس جوہڑ سے سیر اب ہوں گے۔ ایک کہانی کار اپنے قارئین سے صبر و تحمل کا مطالبہ کرتا ہے اور اس وقت یہ مطالبہ زیادہ پر زور ہو جاتا ہے جب اس کی کہانی قارئین کی "ذاتی کہانی" بن جائے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس پیش کردہ دنیا میں کچھ

دیر وقفہ کیا جائے اور اس دھندلے آئینے میں اپنے کچھ نقوش ڈھونڈیں جائیں؛ اگر

قارئین تھوڑی دیر ٹھہر کر ایسے کچھ نقوش ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئے اور کچھ واقعات میں ان کو اپنی ذات کی جھلک نظر آئی، یا وہ ماضی کی کسی حسین یاد کو تازہ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئی؛ تو یہ اُس کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ اگر وہ اِس کو سمجھ پائیں تو یہ اُس کی کامیابی ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ عبدالہادی اور آسیہ کے خوابوں کی تعبیر ثابت ہوں گے۔ میں اس آرزو کے ساتھ آپ سے رخصت لیتا ہوں کہ طلوعِ صبح، نویدِ نو (بہار) لے کر آئے گی!!!

ممکن ہے کتاب کو چھوڑنے کے بعد آپ کے ہاتھ زخمی، جسم خون سے لت پت، آنکھیں پر نم، دل افسردہ، جذبات مجروح، خواب پارہ پارہ ہوں گے۔ آپ کے سینے سے ہوک اٹھ رہی ہوگی؛ مگر میں کیا کر سکتا ہوں کہ یہی ہمارا مقدر ہے! آپ عبدالہادی کی زبانی درد کی روداد سنیئے:

عبداللہ امتیاز احمد

پاہو پلوامہ کشمیر، 17 رمضان المبارک 1440ھ

ہار اور مزار

بسمہ اللہ، اللھم صل علیٰ محمد و الہ و اصحابہ وسلم ، الحمد للہ رب العٰلمین○ --، قل ھواللہ احد○ --،و صلی اللہ تعالی اجمعین --- آمین -

"......................ابو! وہ کہاں پہ دفن ہیں؟"

"بیٹا! اُس بوڑھے چنار کے نیچے جو خستہ قبریں ہیں وہیں ان کا مسکن ہے۔"

یہ سنتے ہی مہدی اس بوڑھے چنار کی اور بے ساختہ دوڑ پڑا اور ان خستہ قبروں سے لپٹ کر دہاڑیں مار کر رونے لگا۔ سرمئی شام اپنے آخری پڑاؤ کی جانب گامزن تھی۔ پرندے اپنے گھونسلوں کی اور جا رہے تھے۔ جن پرندوں نے بوڑھے چنار پر اپنا بسیرا کیا تھا، مہدی کی درد بھری چیخوں نے ان کے سکون کو درہم برہم کر دیا۔ وہ سہمے سے پَر پھڑپھڑاتے ہوئے اپنے آشیانوں سے باہر آئے۔ میں آہستہ قدمی سے چنار کی اور بڑھنے لگا، جہاں مہدی کے آنسو شکستہ قبروں میں جذب ہو رہے تھے۔ میری آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی لڑی جاری ہو گئی۔

بیس سال بعد اُسے اپنی ماں، دادا، دادی، بوا اور چچا کی "قبروں" کو دیکھنا نصیب ہوا! اگر وہ زندہ ہوتے تو مہدی کو دیکھ کر کتنے خوش ہوتے اور مہدی بھی اُنہیں دیکھ کر عالم سرشاری میں کھو جاتا۔ وہ ایک دوسرے کے گلے ملتے، پیار کرتے، گِلے شکوے ہوتے؛ لیکن بے اختیاری کو اختیار میں نہیں بدلا جا سکتا! یہ سب سے مشکل کام ہے اور

پہلے مرحلے سے بھی زیادہ نازک اور خطرناک ہے۔ مہدی کے رونے کی ہچکیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ غم ہلکا کرنے کے لئے میں نے ان کا کاندھا تھپتھپایا۔

"جانی! کیا تم نے فاتحہ پڑھ لی؟"

"جی"

اُس کی آواز میں رونے کی آمیزش میرا جگر چھلنی کر رہی تھی۔

"پھر ہم چلیں؟"

"ابو! میرا دل ابھی کچھ دیر رکنا چاہتا ہے۔"

"بیٹا سب کو پلٹ کر یہیں آنا ہے۔ بس تھوڑی دیر کا انتظار ہے اِس کے بعد ہم سب پھر سے بہم ہوں گے۔ اللہ سے مانگو ہماری زندگی اسلام کے کام آئے، دنیا کے ساتھ ساتھ ہماری آخرت بھی سنور جائے۔"

"ابو، امی اور بوا کا کیا قصور تھا کہ دادا کے ساتھ ان کو بھی۔۔۔؟"

"بیٹا! کوئی بھی مقصد بغیر قربانی دیے یوں ہی حاصل نہیں ہوتا۔ ہم نے تمہارے اور آئندہ کی نسلوں کے لئے ظلم و ستم کی اِن راہوں کو مسدود کر دیا۔ جب ہم نے آہنی زنجیروں کو کاٹنے کی سختیاں جھیلیں، تب ہی تم آسائش و سکون کا لطف لے رہے ہو۔ آزاد فضاؤں میں سانس لے رہے ہو۔

"بیٹا تو اب چلیں۔"

"ابو، کہاں؟"

"جہاں یہ سب پہلے رہتے تھے۔

"ابو، "سرفروش منزل"؟"

"ہاں، "سرفروش منزل"؟"

"چلیئے ابو، اپنا ہاتھ ادھر دیجیے!!!"

نئی وردی کی خوشبو

ہم دونوں باپ بیٹے فاتحہ پڑھ کے قبرستان سے فارغ ہو کر اپنے گانوؤں کی طرف بڑھنے لگے۔ میرے بچپن کے اور اس وقت تک کے گانوؤں میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔ سڑکیں کشادہ ہو گئیں تھیں، نئے نئے مکانات تعمیر ہوئے تھے۔ دکانیں جدید ڈیزائین کے مطابق بنائی گئی تھیں۔ بچوں کے کھیلنے اور بڑوں کے ٹہلنے اور بیٹھنے کے لئے عمدہ باغات بنائے گئے تھے۔ چوکیاں اور مخالف بنکر ہٹ گئے تھے۔ اس لئے اب وہاں سے گزرتے ہوئے کوئی خوف وہراس نہیں تھا۔ ماضی کی طرح عمر کے تمام مراحل ان گلی کوچوں میں محوِ خرام تھے۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ یہ جدید تعمیرات مجھ سے اغماض برت رہی ہیں کیونکہ ہم ایک دوسرے کو نہیں پہچان رہے تھے۔ البتہ راہ میں کچھ پرانے گھر مجھ سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ مجھ سے بہت کچھ کہہ رہے تھے! ان کی دلجوئی کے لئے میں نے وہاں کچھ دیر کے لئے توقف کیا۔ ان سے رخصت ہو کر ہم سامنے والی گلی کے پہلے نکڑ پر اپنے جلے ہوئے آبائی گھر کی طرف شکستہ قدموں سے بڑھنے لگے۔ جو کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس پر پہلی نظر پڑتے ہی میرے سارے وجود میں ہل چل مچ گئی؛ جسم پہ کپکپی طاری ہو گئی، پیر شل ہو گئے، سر چکرانے لگا، کانوں میں گنگناہٹیں ہونے لگی، آنکھوں میں کئی دنیائیں پھرنے لگیں۔

"ابی، آپ ٹھیک ہیں، آپ کے چہرے پر زردی کیوں چھاگئی؟"

"بیٹا ـــــــــ (میں نے اپنے دل کے نالے اور آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا) اس سوال کا جواب یہ کھنڈر ہیں!"

"ابی ------ (مہدی نے حیرانگی کے انداز میں کہا) تو کیا یہی ہمارا گھر تھا؟"

"ہاں میرے لال، ہاں، یہی "سر فروش منزل" ہے۔ یہی وہ خاکِ ارجمند ہے جس کے ضمیر میں آتشِ چنار تھا۔ اِسی آتشیں راکھ میں وہ سب چنگاریاں تھیں جنہوں نے سارے جہاں کو روشن کر دیا۔ اِس خاک سے، اِس راکھ سے، اِس آنگن سے، اِس گھر سے، اِس کے در و دیوار سے میری وہ یادیں وابستہ ہیں؛ جو اپنا ایک منفرد جہاں رکھتی ہیں۔ جی بھر کے اِس کو دیکھ لو، حصولِ مقصد میں اِسے ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اِس میں ہمت و عزم کی کئی داستانیں دفن ہیں! اِنہیں اِس راکھ میں کریدو، پھر اپنی قوم کو سناؤ کہ کتنی عظیم قربانیوں کے بعد تمہیں آزاد فضاؤں کی نعمت حاصل ہوئی ہے۔ اِس خاک کو، اِس راکھ کو، اِس آنگن کو، اِس گھر کو، اِس کے در و دیوار کو چوم لو۔ "سر فروش منزل" کو چوم لو۔ اس "سر فروش منزل" میں وہ عظیم روحیں اب بھی بستیں ہیں جنھیں تاریک راہوں میں مارا گیا۔ بیٹا جاؤ ان سے بغل گیر ہو کر اپنی روح کو تازہ کرو۔"

" اباجانی! دھوپ تیز ہے۔ آپ پھر وہاں پر جو آدھی کھڑی دیوار ہے، سے ٹیک لگا کر اس کے سایے میں ٹھہریے۔ جب تک میں اس کو دیکھ کے آتا ہوں۔"

"جانی! بہتر ہے؛ پر سنبھل کے جانا۔"

"جی ابو، ٹھیک ہے۔

☆☆☆

"کیا—— یہ میرا گھر ہے؟ میرا گھر "سرفروش منزل" میرا وہی آشیانہ جو کبھی آباد تھا! جہاں ہنسی کی گلکاریاں پھوٹا کرتی تھیں۔ جو باتوں کی چہکار سے مثلِ گلستان تھا۔ جو عبادت گاہ، خانقاہ، مدرسہ بھی تھا، جو عظیم ہستیوں کی آماجگاہ تھا۔ جہاں چار سو محبت و اخوت کی خوشبو مہکا کرتی تھی۔ یہ میرا گھر ہے میرا گھر، آسیہ—— کا گھر، سرفروشوں کا گھر، عظیم ہستیوں کا گھر، پاکیزہ روحوں کا گھر۔

"اے میرے اجڑے ہوئے آباد گھر! کیا تو مجھے جانتا ہے، مجھے پہچانتا ہے؟ دیکھ، مجھے دیکھ، میں—— میں پھر سے واپس آیا ہوں۔ تم سے ملنے آیا ہوں، سرفروشوں سے ملنے آیا ہوں۔ آ مجھ سے گلے مل، مجھ سے شکوے کر، شکاتیں سنا، آ! تمھیں یاد ہے ہم نے بہت زمانہ ساتھ گزارا ہے۔ وہ زمانہ جو خوابوں کی کسی حسین دنیا میں کھو گیا اور ماضی کے دھندلکوں میں کہیں گم ہو گیا ہے۔ تو میرے شعور کی وہ ابتدائی منزلیں کہیں بھول تو نہیں گیا؟ شعور کی وہ پہلی منزلیں کتنی حسین تھیں، تھیں نا؟ اب مجھے ان کا احساس ہو رہا ہے۔ تجھے دیکھ کر—— آج پھر شعور کی ان پہلی منزلوں کی حسین یادیں میری طرف لوٹ کر اپنے نازک نازک پیروں سے مدھم مدھم چل کر آ رہی ہیں۔ جب میں سوچ کی دنیا سے دور آزاد فضاؤں میں اُڑ رہا تھا، جن کی بظاہر نظر آنے والی حدود، لامحدود تھیں۔ میری نظروں کے سامنے کتنے دور آئے، گئے، آئے گئے، آئے گئے، جیسے کسی ٹی، وی، موبائل، لیپ ٹاپ یا ڈیجٹل اسکرین کے سامنے آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان آنکھوں نے کیسے کیسے دور دیکھے! اب سب کچھ جیسے ایک خواب لگتا ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں جیسے اِس اسکرین پر بیٹھا اپنی گمشدہ کڑیوں کا نظارہ کر رہا ہوں۔ یہیں سے میں نے شروعات کی تھی اور یہیں پر اختتام! اس اسکرین کے سامنے مختلف کردار آئے اور آ کے چلے گئے۔ دو گھڑی کے لئے ان کے ساتھ شناسائی ہوئی، ان سے دوستیاں کیں۔ پیار بھری باتیں سنیں، سنائیں، وعدے کیے، قسمیں لیں، وفائیں بانٹیں، جفائیں کی، لڑے جھگڑے، روٹھے، منے پھر!۔۔۔۔۔وقت کی گردش میں وہ سب تحلیل ہو گئے، اور

ع ایسے گئے کہ پھر نہ کبھی لوٹنا ہوا

ان ابتدائی مراحل کی یادوں میں اسکول میں داخلے کی یاد کتنی حسین یاد ہے۔ اس کے بارے میں تو مجھے کچھ زیادہ معلوم نہیں، کہ کب ہوا، کس نے کیا؟ ان دنوں بس یہ طریقہ رائج تھا کہ اسکول چلے جایئے، پہلی جماعت کے کمرے میں بیٹھیے فارم ماسٹر آتے اور نام درج کرتے تھے۔ پانچ، دس روپیے فیس دینا ہوتا تھا۔ میرا یہ سفر اپنے گھر سے گانوؤں کی طرف تھا۔ پہلے میں اماں کی نرم و گداز گود کی چھانوؤں سے اپنے آنگن میں اُترا تھا۔ گر گیا تھا، گر کے پھر سنبھل گیا، پھر چلنے لگا، پھر چلنا بھی سیکھ لیا۔ پڑوس کے بچوں سے یاری کی۔ اسکول کی بدولت اب اس کا دائرہ گانوؤں تک پھیل گیا۔ جن میں سب سے پہلے حسیب میرے دوست بن گئے۔ ان ہی کی وساطت سے آسیہ ـــــ، صبا، شبیر، صہیب، لیلیٰ، سیرت، پھر آگے چل کر اس دائرہ میں مدثر، سمیر، عرفان اور خالد بھی داخل ہو گئے۔ انہی دوستوں کی بدولت مجھے نئے نئے الفاظ بھی سننے کو ملے۔ مثلاً ایک لفظ "سرینگر" تھا ایک لفظ "جموں" ایک لفظ "کالج" ایک لفظ "سکریٹریٹ" تھا۔

گانوؤں کے بیچ میں جو ندی بہتی ہے۔ اُنہی دنوں اُس ندی کے ساتھ بھی میرا واسطہ
پڑا۔ رفتہ رفتہ اُس کے ساتھ میرا ربط بڑھتا ہی گیا اور میں نے زندگی کا ایک بہت بڑا
حصہ اس کی معیت میں صَرف کیا۔ یہ ندی میرے لئے حیرت و استعجاب کا ایک
سرچشمہ تھی۔ میرے نزدیک یہ سب "طلسمات" ندی کے اُس پار ہو رہے تھے۔ یہ
سب "کرشمات" اُسی سرزمین کا حصہ تھے۔ دل میں اُن کے لئے طرح طرح کے ارمان
سج رہے تھے اور میں نے اپنے اندر ہی اندر اُن کے متعلق خیالات کی ایک رنگین دنیا
آباد کی تھی۔ یادوں کا ایک حسین جہاں بنایا تھا۔ میرا دیدۂ نظارہ ان کے لئے بے تاب
تھا۔ میری ناتمام آرزوئیں اُن کے لئے تڑپتیں تھیں۔ ندی کے اُس پار سفید رنگ کا
ایک مکان تھا میں اُسی کو کالج سمجھ رہا تھا! میرے نزدیک بڑے بڑے پروفیسر اور آفیسر
حضرات اُسی سے فارغ التحصیل ہو کے آرہے تھے اور اُسی میں وہ ساری رونقیں اور
رنگینیاں وقوع پذیر ہو رہیں تھیں جن کے متعلق میں اپنے دوستوں سے کچھ نہ کچھ سنتا
رہتا تھا۔ حالانکہ یہ عجیب بات ہے کہ وہ مجھ سے چند قدم ہی بچپن اور حقیقی فاصلے سے
دور تھا کہ میرا یہ سارا طلسم ٹوٹتا مگر اس طلسم کو صرف یہی "ندی" برقرار رکھی ہوئی
تھی۔ میرے تصور میں ندی کے اُس پار -- دور —— بہت دور —— ایک بستی کا
تصور تھا۔ پھر ایک دن میرا ندی کے اُس پار جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں، جاڑا ماضی کی
اوٹ میں کہیں گم ہو گیا تھا اور موسم بہار نے اپنی ساری سندرتا اور کوملتا کو کرۂ ارض پہ
بکھیر دیا تھا۔ اس نے درخت کی ڈالی ڈالی کو سبزۂ خلعت سے نوازا تھا۔ کلی کلی پر پھولوں
کی بارش برسی تھی۔ گلی گلی میں عطر بیزی کی تھی۔ ہر دہقان کھیت، کھلیان، اور پہاڑ پر

سبز مخملی چادر بچھادی تھی۔ پرندوں کو حسین حسین جمیل جمیل پَر عطا کیے تھے۔ ان کی زبانوں کو نغمہ زار بنایا تھا۔ صبحیں شبنم کے موتیوں سے نہاتی اور سورج کی کرنیں اس کو منور کرتی تھیں۔ راتوں کو چاندنی اپنی مسکراہٹ سے مزین کرتی اور ستاروں کے قمقمے ان پر اپنا نور بکھیر دیتے تھے۔ خنک ہوائیں اس طرح مدھم مدھم چلتی رہی تھیں کہ دل فرطِ مسرت سے جھوم جھوم رہا تھا اور خوشی کی لہریں موج موج بن کر اچھل اچھل رہیں تھیں۔ پانی کے جھرنے سنگیت چھیڑ رہے تھے۔ سب نظاروں کو گویا دھرتی نے آج مدعو کیا تھا۔ میں اس دن کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ مدّت ہوئی، مگر اس واقعے کی یاد میرے ذہن سے فراموش نہیں ہو پائی۔ میں اس کو فراموش کروں بھی تو کیسے؟ کہ راستے میں خوبانی، ناشپاتی، سیب، انار، آڑو اور بہت سے درختوں پہ سجے پیارے پیارے معصوم پھول قدم قدم پر مسکرا کر نازنین انکھیوں سے میرا استقبال کر رہے تھے۔ -- آیئے۔ آیئے۔ خوش آمدید۔ خوش آمدید -- ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید انھوں نے برسوں اس کی تیاری میں لگا دیے تھے اور آج وہ اپنے حسن کے بھرپور نکھار کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ ان پر بیٹھے چڑیوں، بلبلوں، طوطوں، فاختاؤں، میناؤں، ہزار داستانوں کی جھنڈ سب مل کر گا رہے تھے:

پھر چھڑی رات، بات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی
پھول کے ہار، پھول کے گجرے
شام پھولوں کی، رات پھولوں کی

آپ کا ساتھ، ساتھ پھولوں کا

آپ کی بات، بات پھولوں کی

نظریں ملتی ہیں، جام ملتے ہیں

مل رہی ہے حیات پھولوں کی

میرے دل میں سرورِ صبح بہار

تیری آنکھوں میں رات پھولوں کی

یہ مہکتی ہوئی غزل مخدوم

جیسے صحرا میں رات پھولوں کی

وہ منظر گویا جنت کا ایک منظر تھا-- پریوں کے شہر کا منظر تھا-- شہر طلسمات کا منظر تھا۔ آج تک میں نے اس جیسا منظر نہیں دیکھا اس کی حسرت میں آنکھیں تھک گئیں اور دل کے سُوتے خشک ہوئے مگر وہ منظر پلٹ کر پھر کبھی میری زندگی میں نہیں آیا۔ میں پھولوں کے اس دن کو، پھولوں کی اس رات کو کبھی بھی بھول نہیں سکتا:

کچھ بتا اُس سیدھی سادھی زندگی کا ماجرا

داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

مگر! گردش ایام کبھی بھی پیچھے کی طرف نہیں دوڑا۔ کچھ عرصہ بعد میرے ایک دوست نے ایک عجیب "انکشاف" کیا۔ وہ انکشاف ندی کے اِس پار کا تھا، خود وہ ندی کے اُس پار رہتے تھے۔ اُن کا انکشاف یہ تھا کہ میں نے آج سرکار کو دیکھا! میرے اشتیاق میں اضطراب پیدا ہوا کہ میں بھی سرکار کو دیکھوں۔ اِس پار ایک شخص رہتا تھا جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ میرے اس دوست نے انہی کو دکھایا کہ یہی سرکار ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ شاید سرکار کسی شخص کا نام ہے اس لئے اس شخص کو سرکار تسلیم کر لیا۔ اِس کی نفسیاتی توجیہ اُس کی بڑی بڑی مونچھیں اور بھدی شکل تھی۔ جب آج میں اِس بات پر غور کرتا ہوں تو میرے دوست کا اندازہ اُس دور کے اعتبار سے کچھ غلط بھی نہ تھا کہ بعد میں میرے چمن کی سرکار اِسی ڈراونے اور بھدے خدوخال کے ساتھ ابھری اور ڈر کے مہیب سایے تمام چمن پر لہرائے اور ہماری نفسیات کا ایک حصہ بن گئے۔

میں دوستوں سے نئی نئی باتیں سننے کے لئے بے تاب رہتا تھا۔ ہم روز نئے قصے گڑھتے تھے، نئی کہانیاں بناتے تھے، حالانکہ ان کی کہیں آنت بھی نہ ہوتی تھی مگر ان میں وہ تجسس رہتا تھا کہ آج کئی عظیم کہانیاں ان کے سامنے پھیکی معلوم ہوتیں ہیں۔ کہانی پن کا وہ عنصر ہمیں اب نصیب ہی نہیں ہو پاتا! وہ مزے دار مکالمے اب مفقود ہو گئے! وہ کردار اب نایاب ہو چکے ہیں۔

زمانہ بدل گیا اور اتنی تیزی سے بدل گیا کہ اِس کا احساس بھی نہ ہوا۔ اُس شہر کا سارا طلسم ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ندی کے اُس پار کی اب کچھ بھی اہمیت نہ رہی! وہ سارے خواب نیند سے جاگتے ہی ٹوٹ گئے! وہ سارا تخیّل و تصور محض ایک فریب نکلا! ندی کے اُس

یار اب کچھ بھی نہ رہا!!!نہ کالج، نہ سرینگر، نہ سکریٹیریٹ، نہ وہ آفیسر، نہ وہ نیرنگیاں، نہ رونقیں، نہ جہان پوشیدہ، نہ عجائب گھر، نہ عجائب گھر کے لوگ۔ وہاں تو محض کھنڈر اور جھونپڑپٹیاں ہیں جن کو لوگ گھر اور مکانات کہتے ہیں۔ ندی وقت اور وقت ندی کے بہاؤ میں بہہ گئے۔ جانے حالات کی گردش میں دونوں کس زمین! کس آسمان میں ہیں؟

گھر سے اسکول جانے کے بہانے ہم اکثر باغوں میں جاکر سیر سپاٹا کرتے تھے۔ اسکول جانا ہمارے لئے بہت مشکل کام تھا۔ یہ ہماری بہت سی مرضیات پر قدغن کا باعث تھا۔ اِس لئے ہمیں اسکول جانے کا ڈر تھا۔ اِس ڈر کی ایک وجہ اسکول کی وردی، مشق اور تختی بھی تھی کہ نہ ہونے کی صورت میں مار پڑتی تھی۔ وردی پہننے کا مجھے نہ صرف شوق تھا بلکہ یہ میرے جنون میں داخل ہوچکا تھا۔ نئی وردی پہنتے ہوئے میں ایک نئی خوشبو محسوس کرتا تھا، جو سب خوشبوؤں سے الگ تھلگ اپنی بوباس رکھتی تھی؛ جس سے میرا ذہن ہی نہیں بلکہ دل معطر ہوتا تھا، میرا انگ انگ اِس سے مہکتا تھا، میرے روم روم میں یہ رچ بس جاتی تھی، میں نئی کیفیات میں مدہوش کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا، جو اِس دنیا سے بہت ہی حسین و جمیل، سارے جھنجھٹوں اور بکھیڑوں سے آزاد پُررونق و پُروقار ہوتی تھی۔ اُس خوشبو اور اُس سے منسلک ہر چیز کو میں اب بھی شدت سے محسوس کرتا ہوں، مسلسل یاد کرتا ہوں---یاد کرتا ہوں۔ وردی پہن کر یہ خوشی بھی شامل رہتی تھی کہ آج اساتذہ کی مار نہیں پڑے گی۔ ہم سب دوست ایک دوسرے کی وردی کے متعلق پوچھنے لگتے۔ ہر کوئی اپنی بڑائی جتانے میں لگ جاتا اور اپنی وردی کو دوسرے سے خوبصورت اور قیمتی ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ کچھ دیر بعد

اساتذہ اسکول کے احاطے میں داخل ہو جاتے تو ہم سب پہلے خوف کے مارے منتشر ہوتے پھر "پریر" کے بہانے جمع ہو جاتے۔ پھر رٹے رٹائے الفاظ دہرائے جاتے جن کے معنی تو کیا الفاظ کی صحیح ادائیگی کا بھی ہمیں علم نہ تھا:

اعوذ، اعوذ، باللہ، باللہ، من الشیط، من الشیط،نِ الرجیم،نِ الرجیم۔

بسم اللہ، بسم اللہ، ہِ الرحمٰ، ہِ الرحمٰ،نِ الرحیم،نِ الرحیم۔

اول کلمہ طیب، اول کلمہ طیب۔ اشھد، اشھد، ان لا الہ، ان لا الہ، الا اللہ، الا اللہ، محمدُ ر، محمدُ ر، رسولُ اللہ، رسولُ اللہ ﷺ، ﷺ

دوم کلمہ شہادت، دوم کلمہ شہادت، اشھد.....، اشھد.... سوم کلمہ تمجید....، چہارم کلمہ توحید....، پنجم کلمہ استغفار....، ششم کلمہ رد کفر.......!

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری
لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
ہو میرے دم سے یوں ہی میرے وطن کی زینت
ہو میرے دم سے یوں ہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا

درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے

ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یا رب

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یا رب

علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب

علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب

مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو

مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو

نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

اساتذہ ہم کو گھریلو کام یاد کرنے کے لئے اور کچھ مشق، اسباق کی تختی لکھنے کے لئے دیتے تھے۔ تختی تو ہمارے لئے کوئی مشکل مرحلہ نہ تھا مگر سبق کا سنانا بہت کٹھن

مرحلہ مانا جاتا تھا۔ پہلے تو یاد کرنے کا ڈھنگ ہی عجیب وغریب تھا۔ مثلاً گاے، گاے، گاے ایک، گاے ایک، گاے ایک ایک، گاے ایک پالتو پالتو پالتو، گاے ایک پالتو جانور جانور جانور ہے۔ گاے ایک پالتو، ایک پالتو جانور ہے ہے ہے۔ گاے ایک پالتو جانور ہے ۔اُس اُس اُس اُس کی دو ٹانگیں ، دو ٹانگیں ، اُس اُس کی دو ٹانگیں ، ٹانگیں۔۔۔۔باقی مضامین کا سبق یاد کرنے کا بھی یہی طریقہ تھا۔ پھر اُس کے سنانے کا مرحلہ سخت کوش تھا اِس وجہ سے کہ اُس مرحلے سے کچھ ہی بچے بہ سلامت گزرتے تھے۔ اِس مرحلے میں اساتذہ کو زیر کرنے کے لئے ہم نے کچھ "گر" سیکھ لئے تھے۔ اُن میں ایک گر "مزار کی مٹی" تھی جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اِس کی وجہ سے نیند آتی ہے اور بارہا ہم نے خود بھی اِس کا مشاہدہ کیا تھا۔ لہٰذا اِس کرشماتی ترکیب سے کئی بار ہماری جان چھوٹی تھی۔ دوسرا "گر" یہ کہ ہم سبق کو یوں سناتے تھے ، مثلاً: "گاے ایک پالتو جانور ہے، اُس کی دو آنکھیں، چار ٹانگیں، دو کان ہوتے ہیں۔ لمبی سی دم ہوتی ہے۔ گاے دودھ دیتی ہے۔ گاے ایک بچھڑا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہے۔ جیسے ہی ہم استاذ کی طرف دیکھتے کہ وہ نیند کی ڈبکیاں لے رہا ہے تو ہم "ای ــــ کــــ بچھڑا" کے بعد لولولولولولولو ــــــ کرتے۔ پھر جب دیکھتے کہ آنکھ کھل گئی تو بڑا سا" ہے" کرتے۔ اُن کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ ابھی تک سنا رہا ہے۔ اِسی طرح باقی سوالات کے متعلق ہمارا یہ چلن تھا کہ اُس کا آدھا حصہ یاد کرتے جیسے:

Did the father punish his child when he refused his advice?

"Yes the Father" "باتِ چھُ سوالس منز "یعنی باقی جواب سوال میں ہی ہے۔" کہہ کر اپنی جان چھڑاتے تھے۔ لیکن کئی بار سبق یاد نہ ہونے کی وجہ سے سخت مار پڑتی تھی۔ مار کا طریقہ بھی عجیب تھا کہ کسی تکڑے لڑکے کی پیٹھ پر (اُٹے) چڑھا کر مارتے تھے۔ پہلے ماسٹر جی ایک بید آرام سے مارتے۔ ہمارے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلتی۔ اس کے بعد دوسرا بید پڑتا تھا، دوسری چیخ نکلتی تھی، پھر تیسرے بید کے ساتھ تیسری چیخ، اس کے بعد دڑ دڑ دڑ ڈر مسلسل مار پڑتی تھی اور ہم بھی سر سر سر سر کرتے، اس کے بعد اوں اوں اوں آں آں آں آں اوں آں اوں آں شروع ہوتا تھا۔ ہر بید پڑنے کے دوران ہم یوں ہلتے تھے جیسے کوئی مچھلی کانٹے میں پھنسنے کے بعد ہلتی ہے۔ اس کی وجہ سے پیٹھ پر چڑھانے والا بھی عذاب میں مبتلا ہو جاتا تھا کہ کچھ بید اُس بیچارے پر بھی پڑتے تھے۔ سزا کا ایک سخت مرحلہ "سوَئے" کا بھی ہوتا تھا۔ جب اساتذہ کو محض مار سے تسلی نہ ہوتی تھی تو وہ اِس حربے کو بھی استعمال میں لاتے تھے۔ جس سے ہم "پاپا2" اور "کار گو" سے بھی زیادہ ڈرتے تھے۔

سبق ہم باہر چنار کے سایے میں پھٹے پرانے ٹاٹ اور بوسیدہ بورڈ لے کر پڑھتے تھے۔ چوتھی کہ پانچویں جماعت کی اردو کتاب میں میری ایک پسندیدہ کہانی تھی۔ کچھ سال بعد مجھے اس کہانی کو پھر سے پڑھنے کا خیال آیا۔ میں اردو کی اس کتاب کی تلاش میں نکلا مگر پتہ چلا کہ نصاب تبدیل ہو چکا ہے۔ میں نے بہترے کوشش کی مگر وہ کتاب مجھے نہیں ملی۔ آج مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہم نے نہ صرف اس کتاب کو کھویا ہے بلکہ اردو جیسی شیریں زبان کو بھی کھویا ہے۔ جس کو ہم مسلسل تلاش رہے ہیں مگر وہ روز

بروز ہم سے دور ہوتی جارہی ہے ۔ کبھی کبھی مجھے یہ اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں دوسروں کی اس بے رخی کی سزا ہم کو نہ ملے اور یہ ہم سے ہمیشہ ہمیش کے لئے دور چلی جائے:

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزئ پروانہ ہے

☆☆☆

یِمُوٗ وُلُوٗ

میری زندگی کے دوسرے دور کا آغاز دوستیوں سے ہو چکا تھا۔ گانوؤں میں بہت سے باغات تھے جن میں سیب، خوبانی، ناشپاتی، آلو بخارا، شاہ دانہ، انار، انجیر، اخروٹ، بادام اور طرح طرح کے درخت تھے۔ باغوں سے مُتصِل ہی دھان کے کھیت اور زعفران کی کیاریاں تھیں۔ اگرچہ موسم بہار وادی گلپوش میں اپنی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوتا ہے۔ رنگ بہ رنگے پھول کھلتے اور مزے دار میوے بھی اُگتے ہیں؛ لیکن ہمیں جاڑا اچھا لگتا تھا۔ وہ اِس وجہ سے کہ اِس میں ہماری بڑی پریشانی اسکول کا امتحان، دور ہو چکی ہوتی تھی۔ ہمیں کھیلنے کودنے اور دن بھر موج مستی کرنے کا موقع کُھل کر ملتا تھا۔ پھر بھی گھر والے، رشتہ دار، گانوؤں کے بزرگ ہمیشہ ہمارے پیچھے رہتے۔ ایک دن ہم باغ میں سیب جمع کرنے کے لئے گئے تھے تو اچانک ہمارے کانوں میں یہ آواز کڑک بن کر گونجی:

"ژلوٚوَ -- ژلوٚوَ - بھاگو -- بھاگو -- جلدی بھاگو -- رمضان کاکا وہاں سے آرہا ہے۔ وہ ہمیں باغ میں دیکھنے نہ پائے -- ! جلدی چلو۔ نسیم، خالد، حسیب، شبیر کو بھی بتاؤ جلدی بھاگ جائیں۔ ہاں -- ہاں آسیہ تم بھی جلدی کرو رقیہ، لیلیٰ، صبا اور سیرت کو بھی بتادو تم ایک طرف سے بھاگو اور ہم دوسری طرف کو!"

یہ میرا دوست صہیب تھا۔ آسیہ — کیا کہتی وہ تو رمضان کاکا کا نام سنتے ہی حواس باختہ ہو گئی اِس لئے میں نے فوراً اپنے باقی دوستوں کو بچانے کے لئے آواز دی:

"رقیہ رقیہ، جلدی کرو!"

"کیا ہوا؟"

"وہ دیکھو رمضان کاکا آرہا ہے لیلیٰ، صبا، عرفان جلدی بھاگ جاؤ! رمضان کاکا آگیا۔"

اتنے میں رمضان کاکا کی نظر ہم پر پڑ گئی وہ غصے سے لال ہو کر چلانے لگا۔

"ارے احمقو! ٹھہرو۔۔۔باغ میں کیا کر رہے ہو؟ ابھی تمہاری خبر لیتا ہوں۔ آسیہ، عبدالہادی، عرفان، رقیہ تم ہو، آج تمہاری خبر لیتا ہوں، آخر بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ ٹھنڈے پانی سے سب کو نہلاؤں گا، ایک ایک کر کے مرغا بناؤں گا اور سب کے سروں کے بال منڈواؤں گا۔ جمعہ کیا ہوتا ہے گویا تمہاری عید ہوتی ہے۔ میں ماسٹر جی سے بھی کہہ دوں گا کہ ان احمقوں کی جمعہ کے روز چھٹی نہ رکھا کرے۔ میرے باغ کے سبھی پھل کھا جاتے ہیں۔ آج میں تم کو مزہ چکھاؤں گا۔"

"ارے رمضان میاں تنہائی میں کس سے باتیں کر رہے ہو؟"

"میاں شعبان تم یہاں کہاں؟"

"میں تو کھیتوں کی خبر گیری کے لئے آیا تھا۔"

"اور تم یہ کیا بڑبڑا رہے تھے؟"

"وہ عبدالہادی، آسیہ اور ان کے دوست پھل توڑ رہے تھے انہیں کو ڈانٹ رہا تھا۔"

"ارے میاں رمضان تم بھی بڑے غصیلے ہو! وہ تو ابھی بچے ہیں۔ بچپن میں ایسا نہیں کریں گے تو کب کریں گے، پھر کب ایسا دور آتا ہے؟ بڑے ہو کر سُدھر جائیں گے۔ اپنا وقت تو یاد کرو، تم تو کھیرا اور کریلا کی چوری میں مشہور تھے اور سارے گانوؤں کی عورتیں تم پر گالیوں کی پھلجھڑیاں برساتیں تھی۔"

"ہاں ہاں شعبان میاں تم صحیح کہتے ہو، اس میں بڑا مزہ آتا تھا۔ ناشپاتی، آڑو، کھیرا میں اتنا مزہ نہیں آتا تھا جتنا، مزہ عبد الرحیم، اسماعیل، ابراھیم اور تمہارے ساتھ موج مستی کرنے، ندی میں نہانے، کوئل، کبوتر، مینا، چڑیا، بلبل، ابابیل، کے بچے چرانے میں آتا تھا اور تم بھی تو گھونسلوں کو ڈھونڈ نکالنے اور درختوں پر چڑھنے میں بڑے ماہر تھے ۔ ابراھیم لڑائی اور اسماعیل دوڑ میں، ہاں عبد الرحیم تو گلّی ڈنڈا میں کوئی ثانی نہ رکھتا تھا، محیٔ الدین کبڈی میں طاق تھا، عبداللہ تو گھڑ سواری میں شہسوار تھا، محمد شفیع تو کنچوں کو چوٹ مارنے اور پلا کرنے میں مقابل نہ رکھتا تھا، عبد الغنی سے کشتی میں کوئی جیت نہ پاتا تھا۔"

"ہاں ہاں بڑا مزے دار زمانہ تھا مگر اب وہ کہاں؟ وہ سب تو ایک حسین خواب تھا۔" خیر، وہ تو عین موقعے پر شعبان کاکا ادھر سے گزرے، ورنہ رمضان کاکا ہم سب کو ٹھنڈے پانی سے نہلاتے اور ہمارے سروں کے بال منڈواتے۔ وہ ایک دوسرے کی باتوں میں کھو گئے اور ہم بھاگنے میں کامیاب ہو گئے، لیکن ہماری یہ کامیابی عارضی تھی؛ کیونکہ رمضان کاکا نے ہم سب کے والدین سے شکایت کرنے کی دھمکی دی تھی اِس لئے شام تک ہم بہت خائف رہے گھر جانے کی ہمت نہ کر سکے، لیکن ہمارے پاس

دوسرا کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ اس لئے سہمے ہوئے دل اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے گھروں کی طرف رخ کیا۔ میرا خدشہ اُس وقت یقین میں تبدیل ہوگیا جب میں نے اپنے باورچی خانے سے شعبان کاکا اور ابو کے ہنسنے کی آواز سنی۔ میرے قدم گویا زمین میں گڑ گئے۔ مجھے اب اپنے سنہرے بالوں کا خیال آنے لگا، میں نے بڑے ہی پیار سے اِن پر ہاتھ پھیرا۔ حسرت سے اِن کو آئینے میں ایک بار دیکھنے کی تمنا کرنے لگا؛ مگر آئینہ تو غسل خانے میں لگا تھا اور اس میں داخلہ باورچی خانے کے راستے سے ہی ہوتا تھا جہاں پر ان کا دشمن شعبان کاکا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ اندر سے ہنسی کی آوازوں میں اور زیادہ اِضافا ہوگیا اور حقّے کا کش بھی زور کھینچنے لگا۔ میں خدشہ بھرا دل لے کر کھڑکی کے پاس گیا تاکہ سنوں کہ مجھ کو نہلانے اور بال کاٹنے یا پھر کس منصوبے پر غور و خوض کیا جا رہا ہے، اور میرے بعد کس کی باری ہے؟ حسیب کی، سیرت کی، مدثر کی، آسیہ — کی! ان کا تصور کرتے ہوئے میرے دل کو تسلی ملی کہ میں گنجوں کی فہرست میں اکیلا نہیں ہوں وہ بھی میرے ساتھ ہیں۔ واقعی غم اگر اجتماعی ہو تو اس کو سہنا آسان ہو جاتا ہے اور اگر انفرادی ہو تو جان لیوا بنتا ہے۔ مگر شعبان کاکا تو دل کے بہت اچھے انسان تھے۔ وہ ابو اور امی سے ہمارے بھاگنے کا تذکرہ کر رہے تھے کہ کس طرح انہیں دیکھ کر ہم وہاں سے حواس باختہ ہو کر فرار ہوئے تھے اور وہ ان واقعات کا بڑا لطف لے رہے تھے۔ اچانک امی کی نظر مجھ پر پڑ گئی انھوں نے ابو کو آنکھوں سے اشارہ کر کے میرے آنے کی خبر دی! ابو نے کھڑکی سے میری طرف دیکھ کر مصنوعی رعب والا چہرہ بنا کر ڈانٹ کے انداز میں کہا:

" آج تمہاری خیر نہیں ہے ، آسیہ ، خالد ، لیلیٰ ، صبا ، مدثر کو بھی میں سبق سکھاؤں گا ، رمضان کاکا تم جاکر استرا لے آؤ!"

مگر میں تو ان کی باتیں سن چکا تھا کہ وہ اس طرح کے کسی بھی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے والے نہیں! کیونکہ ابھی تو دسمبر تک پورا ڈیڑھ مہینا باقی تھا اور برف باری بھی نہیں ہوئی تھی، جس میں ہمیں بغیر کسی جرم کے بال کاٹنے کی سزا دی جاتی تھی۔ پھر بھی خیر اسی میں تھی کہ میں ابو سے معافی مانگوں۔ مائیں بچوں کا سب سے بڑا سہارا ہوتی ہیں ہم ہمیشہ ان کو خطرے کے وقت دفاع کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور یہ دفاع کارگر بھی ہوتا ہے، اس لئے میں فوراً امی کی طرف لپکا۔ پر وہ بھی اس واقعے میں مزید شوخی بھرنے کے تلطف میں تھی۔ گویا ناراضگی کے انداز میں کہنے لگی: "ایک شرط پر میں آپ کو ابھی بچا سکتی ہوں، دس مرتبہ اٹھک بیٹھک کر۔" میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ پھر انھوں نے ابو اور شعبان کاکا سے کہا " آج معافی دے دو آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔" پھر مجھے اپنے گلے لگالیا۔ گویا اب وہ اپنی غلطی کی تلافی کر رہی تھی۔ پھر ابو اور شعبان کاکا نے بھی باری باری مجھے پیار کیا۔ اب عمر کے اس مرحلے پر پہنچ کر مجھے خود سے زیادہ ان کے بچپنے پر حیرت ہو رہی ہے کہ یہ تو محض زاویہ اور روپ بدلتا ہے کسی نہ کسی صورت میں ہمارے اندر ہی رہتا ہے اور موقع ملنے پر اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔

جب گانوؤں میں لیتری / شالی کاٹنے کے دن آتے تھے تو لوگ دھان کی فصل کو اپنے اپنے محلے کے کھلیان میں جمع کرتے اور " گوَنی " بناتے تھے۔ ہر گھرانے کے ہاں دس بارہ پولیاں ہوتی تھیں ہمارے لئے اس کی اہمیت کھیل کی وجہ سے تھی۔ اسکول سے

چھٹیاں ہونے کے بعد ہم سب دوست مل کر "یمؤ وؤلؤ" کھیلتے تھے۔ کیونکہ یہ کھیل کھلیان میں ان کی وجہ سے بہتر طور پر کھیلا جاتا تھا۔ رقیہ، لیلیٰ، حسیب اور شبیر میرے جوڑی دار تھے اور آسیہ ـــ ، صبا، نسیم، خالد، صہیب ہمارے مدِ مقابل۔ ہم میں اس وجہ سے کھیل کے دوران آپس میں بہت چشمک رہتی تھی۔ خصوصاً آسیہ ـــ اور میرے درمیان تو اکثر لڑائی ہوتی تھی۔ یہی حال نسیم اور صبا کا بھی تھا۔ ایک گھنٹے تک آسیہ ـــ اور صہیب نے مجھے بہت تھکا دیا اور میں نے بھی ان کو بہت نڈھال کیے رکھا۔ میں اب تھوڑی دیر اس دوڑ سے پرے ہو کر تازہ دم ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے میں ایک بڑی سی پولی کے پیچھے چھپا ہوا ہانپ رہا اور اپنی آستین سے اپنا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ یک لخت پیچھے سے نرم گداز ہاتھ میری آنکھوں پر چھا گئے:

"کہاں چھپ رہے تھے ہم سے، اور کب تک ہم سے چھپ کے رہو گے؟"

یہ آسیہ ـــ -- آسیہ ـــ کی سریلی، رسیلی آواز تھی۔ جواب بھی میرے کانوں میں نغموں کا رس گھول رہی ہے۔ میں نے بھی اپنے ہاتھ اس کے نرم گداز ہاتھوں پر رکھ لئے تاکہ اپنی آنکھوں کو چھڑاؤں؛ لیکن آسیہ ـــ کی گرفت بہت مضبوط تھی، اس لئے میں نے پینترا بدل کے ہاتھوں کے بجائے اس کی گردن پکڑ لی:

"اگر میری آنکھیں نہ چھوڑی تو تمہاری گردن توڑ دوں گا۔"

"نہیں چھوڑوں گی۔ میں بھی تمہاری آنکھیں پھوڑ دوں گی، زیادہ چالاکی نہیں کرنا۔ دونوں کان پکڑ کے معافی مانگ۔"

آسیہ ـــــ بہت زور سے میری آنکھیں پکڑی ہوئی تھی۔ مجھے خدشہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اور تھوڑی دیر اس نے میری آنکھوں کو اسی طرح دبائے رکھا تو یہ اندر دھنس جائیں گیں! میں آسیہ ـــــ کے پنجوں سے چھٹکارا پانے کے لئے سبھی شرائط ماننے پر مجبور ہو گیا۔ اتنے میں خالد، نسیم، صبا، لیلیٰ، رقیہ صہیب اور باقی دوست بھی آ گئے۔ وہ سب آسیہ ـــــ کو داد دینے لگے۔ میں نے ان سب کے سامنے کان پکڑے اور اپنی آنکھوں کو چھڑایا۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو پہلی نظر پہ یہ چُندھیا گئیں۔ آفتاب کئی عکسوں میں بہت سے رنگ لے کر میرے سامنے ظاہر ہونے لگا۔ میں نے اپنے ان دوستوں کی طرف دیکھا تو ان کے چہرے بھی مجھے بدلے ہوئے رنگ برنگے نظر آنے لگے۔ تکلیف بھی ہو رہی تھی، تاہم وہ مناظر مجھے بہت اچھے لگ رہے تھے مگر تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ایک بار میرے ساتھ آسیہ ـــــ، لیلیٰ، مدثر اور خالد تھے اور دوسری طرف صہیب، سیرت، صبا اور حسیب۔ انہیں ہمارا تعاقب کرنا تھا۔ ہم نے آج ایک ایسی جگہ ڈھونڈ رکھی تھی جہاں ہمیں ڈھونڈنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ حسبِ ترکیب ہم اس جگہ چھپ گئے۔ پھر وہاں سے صہیب نے "یِموٗ، یِموٗ" لگاتار پکارا۔ ہم نے تھوڑی دیر بعد "وٗلوٗ" کہا۔ ہم بڑے خوش ہو کر آپس میں یہ باتیں کر رہے تھے کہ آج وہ بہت تھک جائیں گے کیونکہ ہم ان کو نظر ہی نہ آئیں گے۔ اس جگہ کے بارے میں تو ان کو سان گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ ہم بہت دیر تک ان کا انتظار کرتے رہے! جب انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو ہم خود ہی مجبور ہو کر وہاں سے نکل کر اب ان کو ڈھونڈنے لگے؛ مگر وہ

ہمیں نظر نہ آئے۔ میں سیدھے صہیب کے گھر چلا گیا۔ تو پتہ چلا کہ وہ تو تھوڑی دیر کے بعد ہی وہاں سے گھر چلا گیا تھا۔ خود بے وقوف بننے کے بجائے ہمیں بے وقوف بنا کر چلا گیا۔

صہیب بڑا شرارتی تھا اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ اکثر ایسا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آنکھ مچولا کے کھیل میں اس نے میری آنکھوں پر سبز رنگ کی دوہری پٹی باندھی۔ چونکہ اب میں صرف قیاس ہی کر سکتا تھا، وہ ایک ایک کر کے میرے پاس سے گزر جاتے پھر میرے کپڑوں کو پکڑ کر مجھے جھڑکتے، کبھی کبھی ہلکا سا دھکا بھی دیتے تاکہ میں تھوڑی دور چلا جاؤں؛ مگر گروں نہیں۔ پھر وہ سب دور جا کر زور زور سے قہقہے مارتے، مجھے ان پر اتنا زیادہ غصہ آرہا تھا کہ ان میں کوئی ایک بھی میرے ہاتھ لگ جاتا تو میں اس کی بوٹیاں نوچ کر کھا جاتا؛ مگر یہ اس وقت میرے لئے ممکن نہ تھا۔ میں ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے مجھے زور سے دھکا دیا اور میں زمین پر گر گیا۔ میرے سب دوست مجھ پر زور زور سے ہنسنے لگے۔ میں نے ان سے التجا کی کہ "اب میں ہار گیا مجھے رہا کر دو۔" انہیں میرے حال پر رحم آیا اور میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔

"پیچھے سے دھکا کس نے دیا تھا؟"

میں غصے سے چلایا۔

"ہر وقت جو آپ کے پیچھے پیچھے رہتی ہے دھکا بھی اسی نے دیا۔"

صبا نے فوراً کہا۔

"آسیہ ـــــــ میں تم کو نہیں چھوڑوں گا"

میں بڑے زور سے غرایا۔ اس نے مجھے اپنا انگوٹھا دکھا کر دھمکی دی:

"تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے!"

وہ فوراً ہی للکار سنا کر اپنے گھر کی طرف بھاگی۔ یہ تو ہمارا روز کا معمول تھا۔ سچ بھی تھا کہ آسیہ ——ہر وقت میرے پیچھے سے حملہ کرتی تھی۔ وہ میری اس کمزوری کو بھانپ گئی تھی کہ میں پیچھے سے بے فکر ہو جاتا ہوں۔ حالانکہ مقابل ہمیشہ مقابل ہی نہیں ہوتا وہ مخالف بھی ہو جاتا ہے اور تاک میں بھی گھات لگائے بیٹھا رہتا ہے۔

دھان کی چھمائی کے دن ہمارے لئے عید ہو جاتے تھے۔ ایک تو اسکول سے چھٹی ملتی تھی۔ دوسری وجہ یہ کہ بہت سے ہمسایے، دوست اور کچھ رشتہ دار ان دنوں اکٹھے کام کرتے تھے۔ اس لئے بہت چہل پہل اور رونق رہتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو لطیفے سناتے، گِلے، شکوے کرتے یا کسی قصے کو چھیڑ کر لکڑی کے بنے ہوئے بیڈ پر ڈھولک جیسی تال پر دھان کے گچھے کو زور سے مارتے تھے۔ اس کے سنہرے دانے پل بھر میں ڈھیر ہوتے کچھ دور دور تک بکھر جاتے۔ دانے جھاڑنے کے بعد وہ گھاس کے گچھے کو ایک طرف پھینک دیتے جہاں دو تین آدمی گھاس کی گٹھری بنانے میں مشغول ہوتے۔ ہم کو ان گٹھریوں پر چھلانگیں مارنے میں بہت مزہ آتا تھا کیونکہ گھاس اِسپرنگ کی طرح ہمیں اوپر پھینک دیتی تھی۔ صہیب نے دور سے چھلانگ لگائی اور سیدھے میرے پیٹ پر چڑھ گیا، خالد کی نظر پڑی تو وہ بھی دوڑا ہوا آیا، مدثر پیچھے کیسے رہ سکتا تھا؟ تب تک عرفان، آسیہ ——، رقیہ، صبا، لیلیٰ بھی کہیں سے آدھمکے اور ان کے اوپر چڑھنے لگے۔ اب میں سب کے نیچے تھا اور میرے ہاتھ پانوؤں جکڑ گئے تھے۔ اس

کی وجہ سے میرا دَم گُھٹ رہا تھا۔ میں نے آواز نکالنے کی پر زور کوشش کی مگر ان کی
بھگدڑ، شور شرابا اور سب سے نیچے ہونے کی وجہ سے وہ اس کو نہ سن سکے۔ میرا تو بالکل
دم نکلا جا رہا تھا۔ وہ تو خیر، گل محمد چچا ان کو ڈانٹنے کی غرض سے آئے ورنہ وہ میری جان
لے کر ہی دم لیتے۔

اس دن ہمارے گھروں میں طرح طرح کے کھانے پکتے تھے: میتھی، گوشتاب، رستہ،
کباب، یخنی، پالک، ندرو، پنیر، ساگ۔ اسی طرح کئی اقسام کی چائے بھی بنائی جاتی تھی،
زعفرانی قہوہ، بادامی قہوہ، سبز چائے، دودھ کا قہوہ اور اس کے ساتھ قسما قسم کی، بھونی
ہوئی مکئی، چاول کی روٹیاں، قلچے، باقرخانی، شیرمال بھی ملتی تھی۔ مجھے بنے ہوئے چاول
والی "ننُہ چائے" زیادہ پسند تھی۔ اس کا لطف ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ خالص
کشمیری گھی میں بنی مکئی کی روٹی بھی ملتی تو کیا کہنے۔ اس سے بڑھ کر ہمارے لئے زیادہ
اہمیت اس وقت کو ہوتی تھی جب سماوار کے گرد سب جمع ہوتے اور محفل جمتی تھی۔ یہ
دن سوداگروں، کلچے، پراٹھے، پکوڑے، چوڑی، بزازی بیچنے اور "لڈی شاہ" کہنے
والوں کے لئے بھی بہت اہم ہوتے تھے کیونکہ یہ ان کے کاروبار کا سود مند موسم ہوتا
تھا۔ ہم سب اپنی اپنی پسند کی چیزیں اناج کے بدلے خریدتے تھے۔ امی، تائی،
بہن، آسیہ ـــ، صبا، لیلیٰ سب اپنے اپنے لئے حجاب، دستانے، چوڑیاں، کنگن، جھمکا، بالی،
کنگی اور بھی بہت من پسند چیزیں خریدتیں تھیں۔ لڑکوں کے لئے زیادہ سے زیادہ بنیان
یا مفلر ہوتے تھے۔ ہم اس کمی کو پراٹھے اور پکوڑے خرید کر اور "لڈی شاہ" سن کر پورا
کرتے تھے۔

بُڈن کیو جوانن ییتہِ دُجکھ تال
لڈی شاہ بوزِناوِ از گرِمک حال
پننہِ سے گرس منز اَسی تھوِکھ قآد
مظلوٗمن ووٗنکھ بد، ظالمن سآد
بوزِ کُس دوٗہے کیازِ گژھان ہرتال
لڈی شاہ بوزِناوِ از گرِمک حال
یتیمن موٗنڈن ہِنز ہُران ذُرِیاتھ
ظالِمن ہُند ظُلم ییتہِ چھُ دوٗہ راتھ
اِنسانی خوٗن ییتہِ کوٗرُکھ پامال
لڈی شاہ بوزِناوِ از گرِمک حال
مُجووِنٹو کُن پنُن دین و ایمان
کاشرین بچارن تُلکھ طوٗفان
مُحافظ مارناوِتھ روٗٹکھ مال
لڈی شاہ بوزِناوِ از گرِمک حال
بریک ڈاوُن کورُکھ گُلِستانس
چمن وران گوو اَکِس آنس
نابوٗد سپُدی گُل اتہِ وُنگان شال
لڈی شاہ بوزِناوِ از گرِمک حال

مُسلمانس بڑ چھے قیامت ستھ

صبر صرائِطچ ییتہِ کرنُے وتھ

ظالِمن جہنمک ییہِ ولنہِ زال

لڈی شاہ بوزِناوِ از گرِک حال

سکنٓدر قلندر کئُتی حاران

بہارُک سارِنے دِلس ارمان

پزر چھُے بابہ بد اسہ بِ چھِ اعمال

لڈی شاہ بوزِناوِ از گرِک حال

دھینگا مُشتی کرنے کے علاوہ ہم دھان کی بالیاں بھی اکٹھیں کرتے۔ پھر عبدالرزاق کاکا کے دکان سے "بانٹہِ اور سنگتر مِٹھائے" خریدتے تھے اور مزے لے لے کر کھاتے تھے۔ کبھی گھر سے انڈوں کے بدلے میں بھی ان سے مٹھائی یا بسکوٹ خریدتے تھے۔ خوشیوں کا یہی سماں اس وقت بھی ہوتا تھا جب دھان کی بُوائی کا وقت ہوتا تھا۔ اس دوران چھوٹی چھوٹی لڑکیاں حمد، نعت، منقبت پڑھنے کے ساتھ ساتھ لوک گیت گاتیں تھیں۔ ان کے گیتوں کے بول بھی ان کی طرح بہت پیارے ہوتے تھے۔ "نیندِر" / نلائی کے دوران بھی یہی کیف رہتا تھا۔ مرد بھی "نیندِر باتھ" / لوک گیت گا کر سماں میں وجد پیدا کرتے تھے۔ اس سے ساری فضا گونج اٹھتی تھی اور وہ اپنی ہی دنیا میں مست اس کا مزہ لیتے تھے۔

☆☆☆

تتلی کے تعاقب میں:

میں، میرے پیچھے آسیہ —— میرا کاندھا پکڑے ہوئے، ان کے پیچھے خالد، پھر صبا، پھر صہیب، پھر مدثر، پھر سیرت، پھر رقیہ، پھر طفیل، پھر حسیب، پھر حفیظ، پھر آفاق، پھر بشارت، پھر ارشد، پھر شبیر ایک ریل سی بنا کر ہر ایک کا کاندھا پکڑے ہوئے تتلی کے تعاقب میں نکلتے تھے۔ رنگ برنگی تتلیاں! یہ تتلیاں کتنی خوب صورت ہوتیں ہیں۔ پھر دوستوں کے ساتھ ان کا تعاقب ان لمحات کو مزید جاوداں بنا تا تھا۔ جب ہم کسی تتلی کو قریب آتا دیکھتے تو پیچھے سے حسیب پکارتا "حملہ" ہم سب ایک دوسرے کا کاندھا چھوڑ کر تتلی کے پیچھے بھاگ جاتے، مگر تتلیاں تو اپنے ہی انداز میں گُم -- اپنی دنیا میں مست -- اڑنے میں مصروف تھیں وہ ہمارے قابو میں کب آتیں تھیں؟ آسیہ —— کو بڑا شوق تھا کہ وہ کسی تتلی کو قریب سے ہاتھ میں لے کر دیکھے۔ میں اس کے شوق کو پورا کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں آج کسی بھی طریق اسے تتلی پکڑ کے دینا چاہتا تھا۔ میں دور تک تتلی کے تعاقب میں گیا؛ مگر وہ میری رفتار سے مجھ سے دور بھاگی جا رہی تھی۔ اس نے مجھے بہت تھکایا اور میں اس کے پیچھے لگ کر اپنے دوستوں کی نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ وہاں تک جاتے جاتے، میرے نڈھال اور تھکے بدن پر اللہ میاں کو ترس آیا اور میں ایک تتلی پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری خوشی کی انتہا نہ تھی اس لئے کہ اس سے آسیہ —— خوش ہوتی۔ مجھے لگتا تھا اس کی خوشی سے میری خوشی وابستہ ہے۔ وہ خوش ہوتی تو میں بھی خوش ہوتا تھا، وہ اداس رہتی

تو مجھے بھی اداس کرتی تھی؛ حالانکہ ہم دونوں کے درمیان اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائیاں جھگڑے بھی ہوتے تھے اور کبھی کبھی شامگاہ تک، یا دو تین دن تک بھی ایک دوسرے سے بات نہ کرتے تھے۔ میرے وہ دوست چند درختوں کے سایے کے نیچے کھیتوں کی چَوپال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے دور سے ہی پکارا:

"آسیہ ــــــــــ آسیہ ــــــــــ دیکھو-- میں تمہارے لئے تتلی پکڑ کے لایا ہوں !!!!!

"سچ" ــــــــــــــــــــــــــ!!! اسے گویا میری بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ جلدی سے میری سمت اس طرح جھپٹی جیسے تتلی نہیں میں نے اُس کے لئے کوئی خزانہ یا آسمان سے چاند تارے توڑ لائے ہوں۔ وہ تتلی کو اپنے ملائم ہاتھوں میں لینے کے لئے بے قرار تھی۔ اُس کا دل مچل مچل گیا! یوں لگ رہا تھا جیسے اُس کی زندگی کی ایک بڑی مراد پوری ہو گئی! اُس نے اپنی مخروطی انگلیوں سے تتلی کے پروں کو پکڑا۔ اُس کے معصوم چہرے پر اس طرح خوشی چمکی جیسے چنبیلی کے مرجھائے ہوئے پھول میں ایک نئی تازگی آگئی ہو۔

"یہ تتلی کتنی پیاری ہے میں تو اِسے اپنے ساتھ کھانا کھلاؤں گی اور۔۔۔۔"

وہ اپنی بات مکمل بھی نہ کر پائی تھی کہ حسیب نے پیچھے سے بات کاٹی۔

"ارے پگلی یہ کھانا نہیں کھاتی اس کا منہ ہی کتنا بڑا ہے جو یہ کھانا کھائے۔ تم اس بیچاری کو چھوڑ دو"

"تم کیا چاہتے ہو کہ میں یہ تتلی تم کو دیدوں ٹھینگہ کہیں کا (اس نے اپنے انگوٹھے کا مخصوص اشارہ اس کی طرف کیا) یہ تو مجھے ہادو— نے پکڑ کے دی ہے تم کو نہیں دے سکتی۔"

"میں کہاں کہتا ہوں کہ مجھے دے دو میں صرف یہ کہتا ہوں کہ یہ بہت کمزور ہوتی ہے، بیچاری مر جائے گی۔"

"جا جا مجھے پتہ ہے، مجھے اس کو کس طرح رکھنا ہے۔"

وہ اپنے ہی خمار میں نہ جانے کیا کیا بولے جا رہی تھی۔ وہ تو جیسے کسی خواب کے عالم میں کھو گئی تھی۔ ادھر سیرت اور صبا بھی مجھ سے تقاضا کرنے لگیں کہ ہمیں بھی تتلی پکڑ کے دو۔ آسیہ نے تتلی کو خوب صورت کہا تھا اور ساتھ کھانا کھلانا بھی چاہتی تھی وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر حسیب نے اس کی بات ہی اچک لی! شاید وہ اس کو اپنے ساتھ سلانا چاہتی تھی۔ آج جب ان کھیتوں میں تتلیوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے بچپن کے وہ دن رہ رہ کر یاد آتے ہیں، آسیہ— طفیل، شبیر، سیرت کی یاد مجھے بے قرار کر دیتی ہے، نہ جانے وہ اور ان کی تتلیاں کہاں کھو گئیں——؟

تتلی کے علاوہ ایک چھوٹا کیڑا بھی ہمارے لئے تقدس کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کو ہم "خدا صاحِب کی گائے" کہتے تھے۔ اس لئے سب اس کی عزت کرتے تھے۔ اس کو مارنا گناہ جانتے تھے۔ میں ہمیشہ اس بات پر حیران ہوتا تھا کہ اللہ میاں (میں ان دنوں آسمان کو ہی خدا تصور کرتا تھا۔) اس گائے کا دودھ کیسے تھنتے ہوں گے؟ کہ یہ تو بہت چھوٹی گائے ہے! پھر مجھے اس کے تھن کہیں نظر بھی نہیں آتے تھے۔ کیا خدا صاحب کے

لئے اس کا دودھ کافی ہوتا ہوگا؟ اتنے بڑے خدا نے اپنے لئے ایسی چھوٹی گائے کیوں رکھی ہے اور ہم جیسے چھوٹے انسانوں کے لئے اتنی بڑی؟ اُس زمانے میں میرے اِن سوالوں کا جواب کوئی دے سکا، نہ میں نے اِس کی کبھی ضرورت محسوس کی۔ میں بس یقین کرتا تھا کہ ہاں اللہ کے لئے یہ ممکن ہے۔ اُس دور میں اِس کا میرے ایمان کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا لہٰذا مجھے اس بات پر یقین کے مُباحث کی ضرورت نہ تھی۔ اس کیڑے کی طرح ہم مکڑے اور کبوتر کی بھی عزت کرتے تھے! کیونکہ ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ انھوں نے غار حرا میں حضور اکرم ﷺ کے لئے اہم خدمات انجام دی تھیں۔

رمضان المبارک کے مہینے میں ہماری خوشیوں میں دوچند اِضافا ہوتا تھا۔ ایک اس وجہ سے کہ اب عید قریب ہے۔ دوسرا سبب ہماری دوستیوں کا دائرہ وسیع ہونے اور گھر والوں کی ڈانٹ ڈپٹ میں کمی ہونے کا تھا۔ رمضان المبارک ہم مسلمانوں کے لئے انقلاب بن کے آتا ہے۔ ڈھیٹ سے ڈھیٹ اور سنگدل انسان بھی پگل کے موم ہو جاتا ہے۔ نماز، نوافل، قرآن پاک کی تلاوت، غریبوں کی خیر خواہی اور دوسری عبادت میں انہماک و استغراق کی وجہ سے ہر طرف ایک عجیب رونق ہوتی ہے۔ ہم گھر والوں سے ضد کرتے تھے کہ ہم بھی روزے رکھیں گے، اس لئے ہمیں سحری میں جگادیں، جب سحری کا وقت ہوتا تو کبھی وہ ہمیں جگاتے اور کبھی نہیں۔ کبھی ہم اٹھتے کبھی نیند کے غلبے کی وجہ سے نہیں اٹھ پاتے تھے۔ سحری کے وقت اذانوں سے فضا میں لحن داودی کی مدھر لہریں گونجتیں۔ یہ سما رنگ و نور کا باراں برساتا تھا۔ جس دن ہم اٹھتے اس دن پہلے تو "وقتِ سحر — وقتِ سحر" کی آوازوں سے غل مچاتے۔ پھر دس یا گیارہ

بجے تک روزہ رکھتے تھے، اس کے بعد افطاری کرتے تھے۔ اور جس دن ہم نہیں اٹھتے تھے تو اس دن میرے ایک تایا آفتاب نکلنے کے بعد ہمیں سحری کھانے کو کہتے تھے۔ پھر وہ طنزیہ انداز میں کہتے تھے۔ "کیا "تاپی سحر" کھایا؟"، "جی تاؤ کھایا۔" کتنے بجے کھایا؟" آٹھ بجے۔" پھر دن کے دو بجے اس دن افطاری کرتے تھے۔ رمضان میں ہمارا یہ مخصوص نعرہ ہوتا تھا۔ "رۄز دارس ثواب ساس، دۄہل کھاؤس لوری ٹاس" روزہ دار کے لئے ہزار ثواب اور روزہ نہ رکھنے والوں کے لئے ڈنڈے۔ کچھ دوست یہ الفاظ "رۄز دارس" زور سے کہتے تھے۔ باقی "ثواب ساس" اس سے زیادہ زور سے جواب میں کہتے تھے۔ پھر "دۄہل کھاؤس" کہتے تھے اور باقی جواب میں "لوری ٹاس" چلا کر دہراتے تھے۔ یوں گلی گلی میں اس کا ورد کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ شام میں ہم سب افطاری سے تھوڑی دیر پہلے جمع ہوتے تاکہ افطاری کا اعلان کریں۔ جونہی کسی ایک طرف سے ہم افطاری کا اعلان سنتے، تو افطار — افطار — افطار — افطار — کے اعلانات سے ہم ساری فضا میں ارتعاش پیدا کرتے تھے۔ اس کے بعد اپنے گھروں کو بھاگ جاتے اور نماز کے کے بعد فوراً جمع ہوتے تھے۔ دوسرے محلوں کے لڑکے، لڑکیاں بھی آجاتی تھیں اور مل کر نماز عشا تک حمد، نعت اور منقبت پڑھتے تھے۔ لکا چھپی، کھیلتے تھے۔ نابالغ ہونے کی وجہ سے گھر والے نماز کے لئے مجبور نہ کرتے تھے؛ مگر ہم شوقیہ کبھی کبھی مسجد جاتے اور وہاں بھی اپنی شرارتوں سے باز نہ رہتے۔ مغرب میں ہم افطاری بالخصوص "ببری ترئش"، کھجور اور پھیرینی کھانے کی لالچ میں جاتے تھے۔ اور عشاء کے وقت شرارتیں کرنے کے لئے۔ ہم کھجور کی گٹھلیاں

یا نمک کے ڈھلے کانگڑی میں ڈال دیتے جس سے ایک ہلکا سا دھماکا ہوتا۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کی چمٹی لیتے، پانوؤں پر پانوؤں مارتے، یا اپنا منہ آگے نکال کر اپنے ساتھ نماز پڑھنے والے دوست کو عجب شکلیں بنا کر ڈراتے، جب وہ سجدے میں چلے جاتے تو اس کے کندھے پر سوار ہو جاتے۔ ایک دفعہ مدثر نے میرے ساتھ ایسا ہی کیا، میں نماز ہی میں زور سے چلایا۔ جب نماز مکمل ہوتی تو حسبِ معمول ہم پر بڑوں کی نصیحت کی بوچھاڑ پڑتی۔ اس انداز سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس دور سے کبھی گزرے ہی نہیں اور ہمیشہ سے سیدھے سادے، پاکباز، منظم و مودّب تھے۔ پھر ہمیں مسجد نہ آنے کی دھمکی دی جاتی؛ مگر ہم پر اس کا زیادہ اثر نہیں رہتا تھا۔ ہم مسجد سے باز رہتے نہ ہی اپنی شرارتوں سے۔

عید کا دن ہمارے لئے بے پناہ خوشی کا دن ہوتا تھا۔ ہمارے لوک گیت گانے کے دائرے میں جس طرح باقی مہینوں کے بجائے رمضان المبارک میں اِضافا ہوتا تھا۔ اسی طرح عید کے دن اس میں زیادہ اِضافا ہوتا تھا۔ اس دن ہمارے دائرے میں سارے گانوؤں پر محیط ہر محلے کے دوست شامل ہوتے تھے۔ آسیہ ــــــ نے ایک طرف میرا ہاتھ اور دوسری طرف نسیم کا، میں نے ایک طرف آسیہ ــــ اور دوسری طرف صبا کا، اسی طرح صبا نے ایک طرف میرا اور دوسری طرف خالد کا، غرض ہم میں سے ہر ایک دو دو ہاتھوں کو پکڑے ہوئے تھا۔ ہم ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے رمضان المبارک کو وداع کرنے اور عید کی آمد کے گیت گاتے تھے:

عید آیہ رسہِ رسہِ عید گاہ وسہِ وو عید گاہ وسہِ وو

عید آیہ رسہِ رسہِ عید گاہ وسہِ وو عید گاہ وسہِ وو

نماز پَری تھِے تمے اندِ وسہِ وو تمے اندِ وسہِ وو

ییمے اندِ نبی صاب ﷺ تمے اندِ وسہِ وو تمے اندِ وسہِ وو

قرآن پَری تھِے، تمے اندِ وسہِ وو تمے اندِ وسہِ وو

ییمے اندِ سعید صابؒ تمے اندِ وسہِ وو تمے اندِ وسہِ وو

ذکر کَری تھِے، تمے اندِ وسہِ وو تمے اندِ وسہِ وو

ییمے اندِ مخدوم صابؒ تمے اندِ وسہِ وو تمے اندِ وسہِ وو

دعا منگی تھِے وَاپس کھسہِ وو، وَاپس کھسہِ وو

ییمے اندِ ریشی صابؒ تمے اندِ کھسہِ وو تمے اندِ کھسہِ وو

عید آیہ رسہِ رسہِ عید گاہ وسہِ وو عید گاہ وسہِ وو

عید بے پناہ خوشی کا دن اس لئے بھی بنتا تھا کہ اس دن ہمیں سب سے زیادہ پیار ملتا تھا۔ آپس کی رنجشیں مٹ کر باہم شیر و شکر ہو جاتی تھیں۔ ابو، امی، تایا، تائی، ماموں، ممانی ہر کوئی ہمیں گلے لگاتا، ہم سے پیار کرتا، پھر ہمیں عیدی دیتے جس کے سبب اس دن ہم سب امیر ہو جاتے تھے اور اپنی من پسند چیزیں خرید سکتے تھے۔ ہماری من پسند چیزوں میں ایک چیز بندوق --- تھی! بچپن سے ہی ہمیں بندوق کے ساتھ اتنی رغبت کیوں تھی؟ شاید اس وجہ سے کہ یہ ہمارے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔ ہم نے جب

آنکھیں کھولی تو سب سے پہلے اسی نے ہمارا استقبال کیا! کانوں میں اذاں اور کلمے کی آواز سننے کے بعد ہم نے بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی آواز ہی سنی، یا کسی گرینیڈ کے پھٹنے کا شور سنا، یا کسی ماں کی واویلا سنی، یا کسی باپ کی فریاد سنی، یا کسی بہن کی چیخیں سنی، یا کسی بھائی کی آہ سنی، یا کسی دوست کا درد سنا۔ اس لئے ہمیں لگتا تھا کہ ہماری زندگی اور بندوق کا ازل سے ساتھ ہے شاید ابد تک بھی ——————!!! ہم چاہے کچھ بھی خریدتے، بندوق اس کے ساتھ ضرور خریدتے اگر کچھ بھی نہ خریدتے مگر بندوق ضرور خریدتے! پھر ہم کچھ دوستوں کو مخالف اور خبری بناتے اور چند سر فروش بن جاتے۔ اس میں یہ بڑا مسئلہ در پیش آتا تھا کہ مخالف اور خبری بننے کے لئے کوئی تیار نہ ہوتا تھا۔ سب کی مانگ یہی تھی کہ ہم سر فروش بنیں گے۔ چونکہ کھیل کھیلنا تھا اس لئے مسئلے کا کوئی موزوں حل بھی تلاشنا تھا۔ اس کا یہ حل تلاشا گیا کہ ایک دفعہ چند دوست مخالف اور خبری کا رول ادا کریں چند سر فروشوں کا۔ اگلی باری پر مخالف اور خبری، سر فروش بنیں گے اور سر فروش، مخالف و خبری کا کردار ادا کریں گے۔ یہ سب سے اچھی تجویز تھی، اس لئے اس پر سب متفق ہوئے۔ ہمارا میدانِ کارزار پورا گانوؤں ہوتا تھا۔ سرِ فروش، مخالفوں کے دو تین کیمپوں پر حملہ کرتے۔ پھر خبری کے ذریعے وہ ہمارے ٹھکانوں پر حملہ کرتے اور ہمارے چند دوست مر جاتے۔ ہم باضابطہ بستی والے دوستوں کے ساتھ ان کی مرنے پر جلوس نکالتے! جلوس میں ہمارے کچھ مخصوص نعرے ہوتے تھے:

"ہم کیا چاہتے آبادی"، "ہم کیا چاہتے آبادی" ، "آبای، آبادی، آبادی، آبادی"، "تم کتنے خالد --- ہر گھر سے --- خالد"، "تم کتنے صہیب -- گھر گھر سے --- صہیب"، "اے استعارو --- اے دوستو تقدیر ہماری چھوڑ دو" ، اے تمثیلو --- اے ساتھیو دلگیر ہمارا -- چھوڑ دو!"، "کیاہ بنیوو وَنی سمسارو --- الوداع سانے یارو" اس کے بعد پر نم آنکھوں سے اپنے دوستوں کو دفن کرتے۔ پھر ہماری نعرہ بازی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ شروع ہوتی۔ "ہم کیا چاہتے آبادی آبادی"، "آبادی ــــ کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ" "یہاں کیا چلے گا نظامِ مصطفی ﷺ" "نعرۂ تکبیر اللہ اکبر"، "پھولوں والی خوشبو والی"۔

گویا ان کے جانے سے ہمارے حوصلے پست ہونے کے بجائے زیادہ بلند ہوتے تھے اور ہمارے ایمان کو تقویت ملتی تھی۔ اب ہم سب سے پہلے خبریوں کو نشانہ بناتے تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد کھیل کے مطابق شام تک ہمیں ان کے موت کی خبر ملتی۔ ہم خوشیاں مناتے اور اپنے دوست خالد اور صہیب کی قبر پر جاکر انہیں بھی اس کی خوش خبری سناتے۔ اس کے بعد پھر ایک دوسرے پر حملہ کرتے۔ ہم اپنے ان مخالف دوستوں کو اپنی مار کا بدلہ لینے کے لئے ہلکا سا لاتوں اور ہاتھوں سے مارتے بھی تھے۔ جس سے گویا ہمیں تھوڑی دیر کو تسلی ملتی تھی۔ پھر ہم گلستان کی آبادی کا اعلان کر کے بڑے پیمانے پر جلوس نکالتے تھے۔ ہمیں جو عیدی ملی تھی اس سے مٹھائیاں خریدتے اور ایک دوسرے میں بانٹتے۔ پنی سے ہم کچھ مالائیں بھی بناتے پھر باری باری اپنے دوستوں کے گلے میں ڈالتے ان کو ہر طرف سے داد ملتی تھی۔ انہیں ہم تمغے ، اعزازات اور

دوسرے انعامات بھی دیتے تھے، کہ انھوں نے ہمیں عظیم نعمت سے نوازا۔ یوں ہمارا یہ کھیل اختتام کو پہنچتا۔

بندوق کے علاوہ ہم سب دوست گُڑیا اور گُڈی بھی خریدتے تھے اور ان کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ ایک دن ہمیں سوجھی کہ ہم اپنے گڑیا اور گُڈی کی شادی کریں! میرے پاس دو گڑیاں تھیں۔ آسیہ ـــــ نے چار سالوں سے چھ گڑیاں جمع کر لی تھیں۔ رقیہ، صہیب، لیلیٰ، خالد، مدثر، سیرت، صبا بھی اپنی اپنی گڑیاں لے آئے۔ ان میں سے لیلیٰ اور خالد کی گڑیا، گڈی بہت اچھی تھیں۔ اس لئے طے کیا گیا کہ ان دونوں کی شادی کی جائے۔ لیلیٰ کی گڑیا کو دولھا اور خالد کی گڈی کو دلھن بنایا جائے۔ ہم نے ان کا نام بھی رکھا، شہباز اور شہناز۔ اگر نام کی مناسبت سے دیکھا جائے تو وہ دونوں گڑیا، گڈی اسم با مسمیٰ تھے۔ کیونکہ انہیں ہماری طرح زندگی کے دشوار تر مراحل سے گزرنا نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی رہتے! شہباز اور شہناز کی وہ گڑیاں تو آج بھی ویسی ہی ہیں مگر ہم وہ نہ رہے۔ اتوار کے دن ہم نے ان کی شادی کی تاریخ مقرر کر لی۔ یہ کھیل صہیب کے گھر ہونا طے پایا، ہم نے کچھ پیسے بھی جمع کیے تاکہ اس دن کے لئے ٹافی بھی خرید لی جائے اور اپنے اپنے گھروں سے سیب، ناشپاتی، انجیر وغیرہ بھی لے آئے جو کہ بطور "سال" کھایا جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ باضابطہ دعوت کی جائے۔ یہ ذمّے داری مجھے اور آسیہ ـــــ کو سونپی گئی کہ ہم اپنے دوستوں کے ہر گھر میں جا کر انہیں اس میں شریک ہونے کی دعوت دیں اور انہیں بھی یہ تاکید کر رکھی تھی کہ وہ حقیقی مہمانوں کی طرح ہماری مہمان نوازی کریں۔ اخروٹ، بادام، سنگترہ مٹھائی اور ماتم مٹھائی بھی دیں تاکہ وہ اتوار

کے دن ہمارے کام آئے۔ آسیہ ـــ اور میں باضابطہ "دپنہ" گئے۔ پہلے ہم لیلیٰ کے گھر گئے۔ اس نے روایتی طور پر ہماری بڑی خاطر و مدارت کی۔ چائے ہمیں نہیں ملی کیونکہ وہ چائے کا وقت نہیں تھا۔ اپنے دوستوں کے گھروں میں چائے اور کھانا ہمیں ان کے وقت پہ ہی ملتا تھا۔ لیلیٰ نے ہمیں دس اخروٹ پیش کیے جو ہم نے اپنی پوٹلی میں رکھ لئے۔ اس کے بعد ہم خالد کی طرف نکلے۔ انھوں نے بھی خاطر و مدارت کی اور بہت سے بادام ہمیں عنایت کیے۔ پھر ہمارا پڑاو صبا کا گھر تھا۔ خوش قسمتی سے اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ وہ گھر میں "لپٹن چائے" پی رہے تھے، اس لئے یہاں چائے سے ہماری بھی ضیافت کی گئی۔ صہیب اور حسیب بھی اس وقت ان کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ چائے پینے کے بعد ہم اندر کمرے میں چلے گئے۔ صبا نے کچھ سیب جمع کر رکھے تھے جو ہماری جھولی میں ڈالے۔ آسیہ ـــ انہیں روایتی کشمیری انداز میں دعوت دیتی تھی:

"اِنشا اللہ وۄنی آسہِ آتھوارِ دۄہہِ شہبازس تہٕ شہنازس کھاندر۔ توہہِ سارِنے چھِ دعوت۔ ضرور یِیزیو۔ اَسی چھِ توہہِ پراران۔ اگر نہٕ آیہ وِاسہِ گژھوِ ملالہِ۔ اَسی یِمَو نہٕ زانہہ تہٕ تُہند۔"

"انشا اللہ اتوار کے دن شہباز اور شہناز کی شادی ہوگی۔ آپ سب کی دعوت ہے۔ ضرور تشریف لائیے گا۔ ہم آپ کا انتظار کریں گے؛ اگر نہیں آئے تو ہم آپ سے روٹھ جائیں گے اور کبھی آپ کے گھر نہیں آئیں گے۔"

اس کے بعد ہم خود ہی اُپنے اوپر ہنستے تھے۔ ہم ابھی اپنی ہنسی مکمل کر بھی نہ پائے تھے کہ دروازے سے ایک زوردار قہقہہ داخل ہوا۔ یہ سعدیہ چاچی تھی جو ہماری باتیں سن چکی تھی۔ ہم بڑے شرمندہ ہوئے۔ انھوں نے فوراً ہی سوالات کا حملہ کر دیا:

"الو کے پٹھو کن کی شادی کر رہے ہو؟"

پھر ہمارے کان مروڑے، جس سے ہم ڈر گئے ۔ ہمیں لگا شاید ہمارے سارے منصوبے پہ پانی پھر گیا۔ ہمیں بڑا دکھ ہوا کہ نہ جانے "شہناز اور شہباز کے ملن" میں یہ کہاں سے آدھمکی؟ جس طرح دنیا کی بہت سی محبتوں میں کوئی نہ کوئی دشمن آدھمکتا ہے! ممکن تھا کہ ہم رو پڑتے۔ مگر سعدیہ چاچی نے ہم سب کو گلے لگایا، ہمارے ماتھے چومے، ہمارے بالوں میں اپنی ممتا بھری انگلیاں پھیریں۔ سعدیہ چاچی بھی اسی طرح کے پیار کا اظہار کر رہی تھی، جس طرح کے پیار کا اظہار امی نے اس دن کیا تھا جب رمضان کاکا نے ہمیں ڈرانے کے لئے شکایت کی تھی۔ کان مروڑنے کی سزا کی علامت سے انھوں نے ہمارے چہروں کے تغیّر کو بھانپ لیا شاید ہمارے اندر کے ٹوٹے ہوئے خوابوں کی آواز بھی سنی ہو اسی لئے فوراً ہمیں گلے لگالیا۔

"شادی میں اپنی سعدیہ چاچی کو نہیں بلاؤ گے؟"

انھوں نے ہمارا سامنہ اور ہماری سی آواز بنا کر کہا۔ اس وقت تو مجھے وہ سعدیہ چاچی نہ لگی بلکہ صبا معلوم ہوئی۔ ہم اس کے بعد سب دوستوں کو دعوت دینے گئے۔ آسیہ — اپنے مخصوص انداز میں ان کو دعوت دیتی تھی اور وہ ہمیں کھانے کی چیزیں دیتے تھے۔ یوں ہماری پوٹلی بھر گئی۔ اتوار کے دن ہم سب دوست صہیب کے گھر میں جمع

ہو گئے۔ ہمارے "سال" کے لئے اب بہت کچھ جمع ہو گیا تھا جس میں سب سے اہم کردار میرا اور آسیہ —— کا تھا۔ ہم نے گڑیا اور گڈی کو نہلایا، کپڑے پہنائے، پھر ان کو منہدی لگائی۔ کچھ دیر بعد چند دوستوں کو دوسرے کمرے کی طرف بھیجا کہ وہ وہاں سے براتی بن کر آئیں۔ ہم نے یہاں "کاشُر باتھ" کی ایک تال کھینچی۔ براتیوں اور مہمانوں کو کھانا کھلایا جو ہم خود ہی تھے۔ پھر روتے ہوئے شہناز کو شہباز کے ساتھ رخصت کیا۔

بڑی عید (عید الاضحیٰ) کے دن قربانی کرنے والے اپنے ہمسایوں کی دعوت کرتے تھے۔ ہم خصوصی طور پر قربانی کے عمل میں شریک ہوتے تھے۔ وہ اس وجہ سے کہ ہم قربان ہونے والے جانور کو دولھا یا دلھن سمجھ کر اس کو سجاتے تھے۔ آسیہ ——، صبا، لیلیٰ، رقیہ، سیرت تو اپنے گھروں سے منہدی لے کے آتیں۔ ان کے ذمّے قربان ہونے والے جانور کو منہدی لگانا تھا۔ صہیب، مدثر، خالد، حسیب، شبیر اور میرے ذمّے اس کو سرما لگانا تھا۔ ہم محض جانور کو خوش کرنے کے لئے اور اس کے تقدس میں ایسا کرتے تھے کیونکہ ہمارے گھر والے ہمیں سمجھانے کے لئے کہا کرتے تھے کہ یہ اس وقت گھر کا دولھا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ہماری نگاہ میں اس کی وقعت بڑھ جاتی تھی۔ دولھا ہونے کی وجہ سے ہی اس کو نہلاتے، منہدی لگاتے، سرمہ لگاتے، اس کو پیاز کرتے، اس کے ساتھ کھیلتے، اپنے ہاتھوں سے اس کے سر اور بدن میں مالش کرتے: مگر یہ ایسا دولھا ہوتا تھا جس کی دلھن نہیں ہوتی، جو ان کے گھر جا کر "سال" نہیں کھاتا تھا بلکہ خود ذبح ہو کر ہمارے لئے "سال" بنتا تھا۔ جانور کی قربانی کے بعد ہم بچوں کو ایک طرف بٹھا کر قہوہ ملتا تھا۔ ہم ایک کلچہ پیالی میں ڈالتے جو ساری چائے جذب کر لیتا تھا،

اس کے بہانے دو تین پیالیاں پینے کو ملتیں تھیں۔ ایک اور کلچہ ہاتھ میں لے کر تھوڑا تھوڑا پیالی میں بھگو کر کھا لیتے تھے۔ مدثر نے مجھے آنکھوں سے کچھ اشارہ کیا، مگر میں نہ سمجھ سکا، میں نے آسیہ ـــــ کی طرف دیکھا تو اس نے میرا کان اپنے منہ کے نزدیک لیا:

"دپان چھوئی آکھ کلچہ تھاؤ چندس منز نیبری کئنی کھیمو پتئی ساریٔ۔"

"کہتا ہے کہ ایک ایک کلچہ جیب میں رکھ لو باہر جا کے سب مل کر کھائیں گے۔" میں نے یہی سیرت کے کان میں کہا، اس نے حسیب کے کان میں۔ یوں ہم میں سے ہر کوئی کلچہ جیب میں رکھ کے، سب یک بار گی کھڑے ہو کر چل دیتے تھے۔ جیسے ہم نے بہت بڑا میدان سر کر لیا ہے۔ ایک دن میں اگر پانچ ہمسائیوں کے یہاں بھی قربانی ہوتی تو ہم سب کے یہاں جاتے: یہی سرمہ، منہدی لگانے اور قہوہ پینے، کلچہ کھانے کا عمل دہراتے تھے۔

ہمارے لئے عید، غم کا دن اس وجہ سے ہوتا تھا کہ یہ بہت جلد گزرتا تھا۔ ہمیں اس کے گزرنے کا احساس بھی نہ ہوتا تھا۔ اس کے لئے ہم پورا سال انتظار کرتے مگر یہ چند لمحے رہ کر رخصت ہو جاتا تھا۔ ہمیں افسوس ہوتا کہ ہمارے کھیل ادھورے رہے۔ دوسرے محلوں سے ہمارے جو ساتھی آئے تھے ان کے ساتھ ملاقاتیں ادھوری رہیں۔ بہت سی باتیں ادھوری رہیں، بہت سے جذبے ادھورے رہے، بہت سے ارمان ادھورے رہے، بہت سے کام ادھورے رہے۔ بہت کچھ ادھورا رہ جاتا تھا جس سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے سب کچھ ادھورا ہی رہ گیا۔ حقیقی بات بھی یہی ہے کہ

ہم خود بھی ادھورے ہی رہے۔ جتنی خوشی ہمیں حاصل ہوتی، ہم اس سے زائد غمگین

ہو جاتے۔

عید اس وجہ سے بھی ہمارے لئے غم کا دن بنتا تھا کہ اس دن بھی مار دھاڑ۔۔ فسادات

۔۔ کرفیو لگتا۔۔ کریک ڈاون۔۔ گرفتاریاں۔۔ نوحے۔۔ تعزیت!!!۔ چنار کے درخت

پہ لٹکے دیسی جھولے پر ہم سبھی دوست دو دو کر کے ایک دوسرے سے مخالف سمت میں

چہرہ کر کے جھول رہے تھے کہ اچانک ہم نے شور سنا۔ ہم جھولے کو وہی خالی جھولتے

ہوئے چھوڑ کر فوراً شور کی طرف چل دیے۔ میں نے دیکھا کہ ہم سب کے امی، ابو،

بھائی، بہن اور بہت سے لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے؛ جو کہ سب رو رہے تھے۔ میری

نظر عائشہ چاچی اور آسیہ ــــ کی بڑی بہن عافیہ پر پڑی تو وہ بے ہوش ہو چکیں تھیں۔

شاہد کی آنکھوں سے بارش کی طرح آنسو بہہ رہے تھے۔ ہم سمجھ گئے کہ عبدالسلام چچا

کو دوسرے عالم میں بھیج دیا گیا ہے۔ ابو، آسیہ ــــ کو ایک طرف لے جانے لگے؛ لیکن

آسیہ ــــ بھی سب کچھ سمجھ گئی تھی! وہ گریہ کرنے لگی۔

"ابو۔۔ ابو میرے ابو۔۔ نہیں، نہیں۔۔ نہیں، مجھے ابو کے پاس جانے دو۔۔ مجھے ابو

کے پاس جانے دو، میرے ابو، میرے ابو۔"

ہم سب بھی رونے لگے۔

"ہادو، عاشو، مدثر، رقیہ میرے ابو کو کیا ہوا؟ آپ اپنے ابو سے کہیے نا! وہ بات کیوں نہیں

کرتا؟"

"مجھے ابو سے کھلونا لینا ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں تم کو پیاری سی گڑیا گڈی لا کر دوں گا۔ ابو سے کہیں وہ کیوں نہیں لائے؟ میرے ابو وہ کیوں نہیں لائے؟"

آسیہ ــــ نے آسمان سر پر اٹھا لیا، میرے ابو کو اس کے بغیر کوئی چارہ نہ لگا کہ انہیں اپنے باپ کی میّت کے پاس لے جا کر ان کا چہرہ دکھائے۔ آسیہ ــــ عبد السلام چچا کے چہرہ کو ہلا کے، سر کو حرکت دے کے، ہاتھوں کو اٹھا کے رونے کی چیخوں کے ساتھ کہہ رہی تھی:

"ابو اٹھو، ابو اٹھو، میرے ابو تم کیوں نہیں اٹھتے؟ تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟ مجھے اپنی گود میں بٹھالو، مجھے گڑیا گڈی لا کر دو۔ اچھا ابو میں تم کو اب تنگ نہیں کیا کروں گی۔ مجھے یہ نہیں چاہیے مگر ابو تم اٹھو، ابو ابو ابو، آعا، ابو۔۔۔ اب ب و

اٹ ٹ ھ وووو ــــــــــــــ!!!"

اس کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو گئی اور ہمیشہ کے لئے اپنے ابو سے جدا ہو گئی۔ مجھے آسیہ ــــ اور سیرت کی چپلوں کا خیال آیا جو انھوں نے جھولا جھولنے کے دوران ایک طرف رکھیں تھیں۔ میں دوڑ کے وہاں گیا تو اس جھولے کی طرف مایوس و محروم نظروں سے دیکھا جس پر ابھی کچھ دیر پہلے آسیہ ــــ جھول رہی تھی۔ اب وہ خالی جھول رہا تھا، وہ تھرا تھرا کر بہت اوپر بہت نیچا جا رہا تھا، اپنی کچھ کچھ کچھ سے جیسے پکار رہا ہو: "آسیہ ـــ، آؤ، ادھر آؤ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ اب تمہارے ابو کی نرم گود کا جھولا نہیں رہا۔ اب میں ہی تمہارے ابو کی گود بھی ہوں اور جھولا بھی! جس طرح کہ تم سے پہلے میں شاہینہ، صدف، رقیہ، اعجاز، بلال، سجاد ہر کسی کے ابو کی شہادت پر بن چکا

ہوں۔"یوں دنیا کی عید ہمارے لئے ماتم بن جاتی اور بے پناہ خوشی بے پناہ غم میں تبدیل ہو جاتی! اس طرح کی موت کا یہ تسلسل بھی زندگی کی طرح جاری تھا۔

شوال المکرم کے بعد ذی قعدہ میں ہماری سرگرمیاں حاجیوں کو رخصت کرنے کی طرف منتقل ہوتی تھیں۔ گانوؤں میں مشکل سے ایک دو حاجی ہوتے تھے۔ ضلع کے اعتبار سے ان کی تعداد قلیل بنتی تھی۔ اس لئے جس گانوؤں سے حاجی رخصت ہوتے، وہاں کے باشندے جلوس کی صورت میں ان کے ساتھ نکلتے تھے۔ جب وہ دوسرے گانوؤں میں پہنچتے تھے تو وہاں کے حاجی کے جلوس کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ یوں یہ جلوس بڑے ہجوم میں تبدیل ہو جاتا۔ ہمیں زیادہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا؛ لیکن: "لا الہ الا اللہ -----حج درائے بیتُ اللہ، لا الہ الا اللہ -----حج درائے بیتُ اللہ" کی نعرہ بازی کرنے، مٹھائی، بادام اوراخروٹ سمیٹنے کے شوق میں ہم بھی حاجیوں کے قافلے کے ساتھ جاتے تھے۔

بڑی عید کا اختتام جاڑے کی نوید لے کر آتا تھا۔ ہمیں یوں محسوس ہوتا کہ موسم سال کا نہیں بلکہ خود ہماری زندگی کا ایک حصہ ہے۔ ہر موسم کے ساتھ ہماری بے چینی اور انتظار بھی وابستہ ہو گیا تھا۔ ہم برف باری کا انتظار بھی بڑی شدت سے کرتے تھے۔ برف باری ہوتے ہی ہمارے چہرے خوشی سے چمک اٹھتے تھے۔ ہم اس کا مزہ لینے کے لئے باہر آنگن میں نکلتے تھے اور جسم پر برف پڑنے کی وجہ سے عجیب لذت سے آشنا ہوتے۔ گویا ہم خود بھی برف کا ایک حصہ بننا چاہتے تھے مگر ہمارے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ ہم آسمان سے ٹپک جائیں! ہم اپنی آنکھیں مسلسل اور تیز تر گرتے برف پر مرکوز

کرتے تھے جس کی وجہ سے کچھ لمحوں بعد یوں معلوم ہوتا کہ ہم اوپر آسمان کی طرف بہت تیز رفتاری سے اڑ رہے ہیں۔ یہ تجربہ ہمیں آسمانوں کی سیر پر لے چلتا تھا۔ برف باری میں ہم زیادہ دیر ٹھہر نہیں پاتے تھے کیونکہ سردی نسوں اور شریانوں تک گھس جاتی تھی۔ بیمار پڑنے اور گھر والوں کی ڈانٹ کا بھی شوشہ ہوتا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد تو ہرگز بھی گھر والے باہر نکلنے نہ دیتے تھے۔ وہ ہمیں "شنئہ ڈائن" سے خائف کر رہے تھے۔ اس کا ظہور برف پڑنے کے بعد ہوتا تھا۔ اس کی صورت ڈراونی، آنکھیں غضبناک اور بال بکھرے ہوئے ہوتے تھے۔ لرزہ طاری کرنے والی بات گانوؤں کی بڑی بوڑھیوں کے مطابق اس کے پانوؤں کا الٹا ہونا تھا؛ یعنی اس کے پنجے آگے کی طرف نہیں بلکہ پیچھے کی طرف ہیں۔ اس سے وہ ہمیں قابو میں رکھنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ وہ ہمیں "مرژِ وانگن بُڈ" سے بھی ڈراتے تھے۔ جو جیٹھ، اساڑھ، ساون، بھادوں میں کھیتوں میں گھوما کرتی تھی۔ اور اس کے پیچھے ایک زنبیل ہوتی تھی جس میں وہ بچوں کو پکڑ کے لے جاتی تھی۔ یہ تو ہم انھوں نے اس لئے باندھی تھی کہ ہم کھیرا، گاجر، مولی، ناشپاتی، سیب وغیرہ کی چوری نہ کریں؛ لیکن ہم اس سے پرے کیسے رہ سکتے تھے اس لئے ہم سب دوست مل کر جاتے تھے۔ اسی طرح وہ ہمیں "برم رم چوک"، "تصرف دار"، "بھوت" اور بہت سی غیر مرئی مخلوقات سے ڈراتے تھے۔ پر ہمارا سابقہ کبھی بھی ان سے نہیں پڑا بلکہ وہ سب کے سب ڈراونے، کریہناک، غضب ناک اور ہیبت ناک کردار ظالم انسانوں کی صورت میں سامنے آئے اور اپنی ہی جنس

کے دوسرے انسانوں کو ایک ایک کر کے کھا گئے، چبا گئے اور چبا کے ان کی ہڈیوں کو صحراؤں میں پھینک گئے!

برف باری اکثر دو دو تین تین شب و روز جاری رہتی۔ جس سے مکانوں کی چھتیں گر جاتیں، کئی درخت ٹوٹتے، سڑکیں اور شاہراہیں بند ہو جاتیں، بجلی مہینوں غائب رہتی، نظام زندگی درہم برہم ہو جاتا۔ ہمارے لئے اس سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا کیونکہ ہمیں تو اپنے کھیلوں سے غرض ہوتی تھی۔ ہم برف باری کے رکنے کا انتظار اور اللہ میاں سے اس کے بند کرنے کی دعائیں صرف اس لئے کرتے تھے کہ اب ہم برف کے مجسمے بنانا چاہتے تھے۔ جب برف گرنا بند ہوتی تو ہم اس سے زیادہ خوشیاں مناتے۔ پھر ایک ایک کر کے سب جمع ہوتے اور مجسمے بنانے میں مشغول ہوتے۔ ہم ایک دوسرے کا برف کا مجسمہ "شِنہ موہنیو" بناتے تھے۔ "کانگریوں" سے کوئلا نکال کر اسی سے ان کی آنکھ ،ناک، کان، منہ اور بال بناتے تھے؛ البتہ بازو برف کے ہی ہوتے تھے۔ اکثر کیا ہوتا تھا کہ ہم اس کا آدھا دھڑا ہی بناتے تھے۔ صبا نے صہیب کا مجسمہ بنایا تو اس کی ناک ٹیڑھی رکھی، بدلے میں صہیب نے بھی اس کا مجسمہ بنا کے اس کو ایک ہاتھ سے معذور رکھا۔ خالد نے لیلیٰ کو ایک آنکھ سے اندھا رکھا تو جواب میں اس نے اس کا چہرہ ٹیڑھا بنایا۔ اس سے پہلے کہ آسیہ ——— مجھ پر کوئی حملہ کرتی میں نے فوراً اس کا ایک مجسمہ بغیر نقص کے بنایا۔ صرف اس وجہ سے کہ مجھے آسیہ ——— کی شرارت کا پتہ تھا۔ اس لئے آسیہ ——— نے بھی میرا مجسمہ ٹھیک ٹھاک ہی بنایا مگر مدثر اور سیرت کو یہ برداشت نہ ہوا کہ ہمارے مجسموں کے بھی اعضا درست ہوں۔ اس لئے انھوں نے میری ناک

اور آسیہ ــــ کے کان کاٹ ڈالے۔ ہم غصے سے ان پر برف پھینکنے لگے۔ ہمارا ساتھ صہیب، خالد، رقیہ، شبیر، حسیب نے بھی دیا، پھر یکایک ہم ایک دوسرے پر بھی حملہ کرنے لگے اور دیر تک ہمارے درمیان یہ "سرد جنگ" چلتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد برف کے یہ مجسمے پگل کر کم جثہ ہو چکے تھے۔ ہمارے سروں کا اکثر حصہ غائب ہو چکا تھا، کوئلے کی سیاہی اس سفیدی پر پھیل چکی تھی۔ پانوؤں کے بنے ہوئے نشانات زمین میں دھنس گئے تھے۔ ہم خود بھی فاصلوں کی گرد میں نہ جانے کہاں گم ہوئے تھے؟ ہماری زندگی کی مثال تو اس سے کچھ مختلف تھی ہی نہیں۔ یہ مجسمے ہماری تمام تر زندگی کی عکاسی کر رہے تھے۔ یہ مٹ گئے تو اگلے سال پھر برف پڑی، نئے مجسمے بنے، پانوؤں کے نئے نشان پڑے، پھر یوں ہی مٹ گئے۔ بننے، بن کے مٹنے کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور جاری رہے گا۔ برفیلی جنگ بھی جاری رہے گی۔ کیا انسانی زندگی اس سے مختلف ہے؟

برف باری میں برف کو کسی برتن میں لا کر اس میں دودھ اور شکر ڈال کر دیسی قفلی (قلفی) بنانا اور چھتوں کی ڈھلانوں پر جمی ہوئی برف کی "شِشر گانٹھ" اتار کے مزے سے کھانا بھی ہمارا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

برف پڑنے کے ساتھ ہی ہمارے سروں سے بال غائب ہوتے تھے۔ گویا برف باری جاڑے کی نہیں بلکہ بچوں کے بال کاٹنے کی نوید ہوتی تھی۔ ہم دوستوں میں سے کسی کے ابو یا بڑے بھائی ہمیں حجام کے پاس لے جاتے اور ہمارے سر سے یہ بوجھ اتار کر

آتے تھے۔ پھر ہم ایک دوسرے کے ساتھ مذاق کرتے ایک دوسرے کے سر کو بطور ڈھولک استعمال کر کے جین ٹائلر صاحبہ کی نظم "تارے" پڑھتے تھے:

"ٹِنہ کلہ ٹِنہ کلہ لیٹل سٹار، ہاؤ آئی ونڈر وٹ یو آر، اَپ ایبو دی ورلڈ سو ہائی، لائک اے ڈائمنڈ ان دے سکائی، ٹِنہ کلہ ٹِنہ کلہ لیٹل سٹار" ٹِنہ کلہ "یعنی "گنجا"۔ گویا ہم سب ٹُونکل، جگ مگ کرتے، چمکتے چھوٹے گنجے تارے تھے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ہم سب تارے تھے۔ ہیرے تھے جو نہ جانے کہاں وسیع آسمان پر سے ٹپک کر زمین میں کھو گئے؟ یا برف کے ان مجسموں کی طرح مٹ گئے؟ جب آج میں آسیہ —، صہیب، خالد، حسیب، صبا، لیلیٰ، کے اس گنجے پن کا تصور کرتا ہوں تو مسرور و مغموم ہو جاتا ہوں۔ دل شدّت سے ان پرانے دنوں میں لوٹ جانے کی خواہش کرتا ہے۔ حسیب کے پاس، صبا کے پاس، شبیر کے پاس، سیرت کے پاس۔۔۔۔ آسیہ، آسیہ — کے پاس جو آسیہ — ٹِنہ کلہ کر کے بالکل ہی ایک جوکر لگ رہی تھی۔ میں اس آسیہ — کا تصور کر کے آج بھی ہنسی میں لوٹ پوٹ ہوتا ہوں۔ اور اس وقت تو اس کو بالکل ہی روک نہیں پاتا ہوں۔ جب آسیہ — کے رونے کا خیال آتا ہے۔ آسیہ — میں جہاں بہت سی خوبیاں اسے باقی لوگوں سے الگ کرتی تھیں۔ وہیں اس کے رونے کا انداز بھی نرالا تھا۔ وہ مغرب کی نماز سے ایک گھنٹے پہلے رونا شروع کر دیتی تھی اس کے بعد عشا تک مسلسل روتی رہتی تھی۔ آپ لاکھ چپ کرائیں وہ نہ مانتی تھی۔ اُوں۔ اُوں "ونی کرتہ خدایہ ساند پاس ژھوپی" اب خدا کے لئے چپ ہو جاؤ! عائشہ چاچی دق ہو کر کہتی۔ اُووں ں ں آسیہ — اور زیادہ اونچی

آواز میں شروع ہوتی اور اپنی تمام ان فرمائشوں کو دہراتی جو پوری نہیں کی گئی تھی۔"
تمی دوہہ اونوۄ بٹیس بوٹھ میہ اونوۄنہ کہینہ۔ تمس انی ووٗ ووزج بنیان میہ انی وو سفید"
اس دن بھیا کے لئے جوتا لایا میرے لئے نہیں لایا۔ اس کے لئے سرخ بنیان لائی اور
میرے لئے سفید۔" آساتول ژیتہ انہوئی" اچھا تمہیں بھی لا کر دیں گے۔ اب چپ
ہو جا۔ اُووں ں ں ں ں ——— زیاد زور سے "باکری نی کہینہ" میں چپ نہیں کروں
گی۔ ہفتے میں تقریباً تین دن یہ آسیہ ——— کا معمول بن گیا تھا۔ پھر وہ عبدالسلام چچا کی
آمد کے ساتھ ہی خاموش ہو جاتی۔ وہ اس کو گود میں لیتے تو اسے قرار آجاتا۔ آپ نے
اس کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ عائشہ چاچی عبدالسلام چچا کو کوسنے لگتی۔

جاڑے میں ہمارا ایک کھیل "سزِ لونگ" بھی ہوتا تھا۔ اکثر ہمارے کھیلوں کی شروعات
اسی کھیل سے ہوتی تھی۔ اس کھیل کے دوران اکثر آپس میں ہماری لڑائی ہوتی تھی۔
پھر ہم ایک دوسرے سے روٹھ جاتے تھے۔ روٹھنے میں ہم ایک مخصوص علامت کا
استعمال کرتے تھے ؛ یعنی چھنگلی کو چھنگلی سے ملاتے ہوئے انہیں موڑ کر کہتے تھے۔"
میرے ساتھ کٹی ہے۔" پھر جب صلح ہوتی تھی تو بھی چھنگلی سے چھنگلی ملا کر کہتے تھے۔"
میرے ساتھی سلی یعنی صلاح ہے" ایک شام آسیہ ——— نے میرے ساتھ لڑائی کرنے
کے بعد کٹی رکھی۔ دوسرے دن سویرے ہی وہ ہاپو ٹاپو / اتی پتی کھیلنے کے لئے کھلیان
میں آئی تو میں وہیں پر خود سے باتیں کرتا ہوا کھیل رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف کوئی
توجہ نہ دی، جیسے اس کو دیکھا نہ ہو اور اپنے کھیل میں مصروف بُھد کتا رہا۔ پانچ چھ منٹ

کے بعد جب اس کے برداشت کی حد بے قابو ہو گئی۔ تو اس نے اس مخصوص انداز میں بات شروع کی جو ہم روٹھنے کے بعد گویا کسی اور کو مخاطب کر کے استعمال کرتے تھے: "دپان چھی باتی گِندا: کہتی ہے کیا میں بھی کھیلوں"، "دپُس میہ سیت ماکر کتھ: ان سے کہیے کی مجھ سے بات نہ کرے۔"، "دپُس ژیہ سیت کوسی چُھو کران کتھ: ان سے کہیے کہ تم سے کون بات کرتا ہے؟" دپُس اکیہ کرن نا: ان سے کہیے کہ یہ کی نا، "دپُس میئ دوَ پوئ یوتئ یوت گندوا: ان سے کہیے کہ میں نے صرف اتنا کہا کہ کیا کھیلیں؟ دپُس وٗالی گندوٗنی، ان سے کہیے کہ آؤ کھیلو اب۔ یوں ہماری کٹی بھی صلح رہتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا، جب آسیہ ــــــ کو لگا کہ میں بازی ہار رہی ہوں تو وہ میری "کِتر" لے کر بھاگ جاتی تھی۔ وہ اتنی پھرتیلی تھی کہ میں اس کو پکڑ بھی نہ پاتا تھا۔

جاڑے میں ہمارا ایک اور دلچسپ مشغلہ "دلیل" (داستان) سننا تھا۔ ہمارے پرنانا جو ایک صاحب نسبت بزرگ تھے، ہمارے ننہال آجاتے تھے۔ ان کی وجہ سے گانوؤں کے اکثر لوگ ان کی صحبت میں بیٹھنے کے لئے آتے تھے۔ گلشنِ عزیز میں برف پڑھنے کے دوران اکثر کاروبار رک جاتا تھا۔ لوگ مٹر بُنتے، نرم ستھو کے ساتھ گرم گرم نُنہ چائے پیتے اور راجمہ دال الاؤ پر چڑھا کر شام کے کھانے اور سالن کا انتظام کر کے باقی وقت ذکر و عبادت اور دلیل سننے میں گزار دیتے تھے۔ ہم بھی شوق سے نماز، اوراد اور درود پڑھتے۔ رات کا کھانا جلدی کھا کے پرنانا کے کمرے میں اپنی نشست پکڑ لیتے تاکہ دلیل سنیں۔ دلیل کیا ہوتی تھی وہی پریوں کی، جنوں و دیوؤں کی، شہزادوں کی شہزادیوں کی۔ دراصل وہ تمثیل میں حقائق کو بیان کرتے تھے۔ اس کے دوران

مسلسل چاے کے دور بھی چلتے تھے۔ پوری داستان تو ہمیں یاد نہ رہی البتہ جب اس کی آخری قسط ناناجی نے سنائی تو اس دن مجلس میں اکثر لوگ روئے۔ وہ دراصل رلانے والا واقعہ ہی تھا۔

☆☆☆

نور کی آمد

ناناجی نے دلیل کی آخری قسط اپنے مخصوص انداز میں اس شعر سے شروع

کی:

کہاں سے ابتدا کیجیے بڑی مشکل ہے درویشو

کہانی عمر بھر کی اور جلسہ رات بھر کا ہے

جو پہلے امن و آشتی سے مزین تھی لیکن بعد میں ظلم و تعذیب سے بھر گئی جس کا ہنوز
کوئی اختتام نہیں تھا۔ ناناجی کہا کرتے تھے کہ "ہم بھی اس کہانی کے کردار ہیں!"
ناناجی کے بقول کہنے والے استاد کہتے ہیں:" کہ اس زمیں پر ایک خوب صورت "سکون
آباد" نامی وادی تھی، جو ہر طرف فلک سیر، سرسبز اور چمکتے برفیلے پہاڑوں، کوہساروں
سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وہاں پانی کے ابلتے سیمابی چشموں کی شورش سے باجے بجتے تھے۔
جھرنوں اور آبشاروں کا پانی موج موج بن کر مدھر تانیں چھیڑتا تھا۔ وہاں فضاؤں سے
عطر و عنبر برستا۔ رنگ برنگے پھول کھلتے اور مہکتے تھے۔ کلیاں اٹھکھیلیاں کرتیں،
ہرے بوٹے دل موہ لیتے، ان سے بغل گیر ہونے کو دل مچلتے ۔ فاختہ، چڑیہ ،
بلبل، ابابیل اور کستوری کے چہچہے سے لذت سرود تھا۔ دلدلی زمیں میں مخملی سبزہ بچھا
تھا۔ قدرت نے اسے لازوال حسن عطا کیا تھا۔ وہ ہر دم ایک نئی نویلی دلھن کی طرح

سجی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس سرزمین کے عارض کا ہر غازہ خوشنما لگتا تھا۔ اس کی بہار میں بھی ایک جمال تھا اور خزاں میں بھی ایک جلال۔ وہ وادی مثلِ جنت سمجھی جاتی تھی۔ وہاں بسنے والے لوگ آزاد تھے وقت کے قزاق ان کو لوٹنے پہنچ جاتے تھے؛ مگر قدرت نے ان کو ہمیشہ محفوظ رکھا۔ سکون آباد کو قدرتی دفاعی نظام بخشا گیا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ آج سے آٹھ سو سال پہلے آسمانوں کی سیر کرتا ہوا وہاں ایک نور پہنچا۔ سب لوگ اس کا نظارہ اپنی کھلی آنکھوں سے کرنے لگے۔ اُس میں سے ایک آواز نکلتی تھی: "**سب متحد ہو کر ایک جگہ جمع ہو جاؤ**"۔ اس آواز کو سن کر لوگوں کے قدم خود بہ خود چلنے لگے اور سب ایک جگہ جمع ہو گئے، جہاں آکر یہ نور ٹھہرا۔ پھر سکون آباد کے لوگوں نے اس کی دل و جان سے خاطر و تواضع کی۔ بادشاہ نے خود اس کے پاس آکر استقبال کیا۔ اس کا اس قدر شاندار استقبال ہوا، جس کی نظیر سکون آباد میں اس سے پہلے کبھی دیکھی گئی نہ تاریخ میں کہیں ایسی مثال ملتی ہے۔ بادشاہ نے گویا ہو کر اس سے گزارش کی کہ:

"ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ ہم آپ کو شاہی مہمان بنانے کے خواہاں ہیں۔"

"میں آپ کے جذبات اور اعلیٰ انسانی اقدار کی بہت قدر کرتا ہوں؛ مگر میں گھروں میں نہیں دلوں میں ٹھہرتا ہوں اور مجھے یہ فرمان ملا ہے کہ میں سب کا مہمان بن کے رہوں۔ صرف ایک ہی گھر میں نہیں ٹھہر سکتا۔ اس لئے آپ اپنی رعایا کو بلائیے، تاکہ میں ہر ایک کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہوں۔ میں بلا اجازت یا جبری طور پر کسی بھی گھر میں داخل نہیں ہوں گا اور نہ کسی دل میں ٹھہر سکتا ہوں۔"

نور نے کہا!

بادشاہ سلامت نے اپنی رعایا کو مدعو کیا۔ اپنے وزرا سے مشاورت کی۔ سب نے اس بات کی تصدیق کی کہ:

"ہماری وادی میں آنے والے یہ مہمان بڑے شریف النفس، اعلیٰ صفات سے متصف اور انسانیت کے اصل مقام سے آگاہ ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے خود بادشاہ سلامت انہیں اپنے گھر لے جاکر اپنے دل میں داخل کریں۔ پھر باقی لوگوں کے لئے آسانی رہے گی۔ اب اگر کسی نے اِس نور کو اپنے گھر میں داخل کرنے سے انکار بھی کیا تو اُس سے کوئی مواخذہ نہ کیا جائے۔ مگر امید ہے کہ یہ نور تمام گھروں میں داخل ہو گا۔ ہم نے اِس کی آنکھوں میں دلوں کو تسخیر کرنے کی ایک قوی چمک دیکھی ہے۔"

یوں یہ نور سب سے پہلے بادشاہ سلامت کے دل میں شاہی مہمان بن کے ٹھہرا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سکون آباد کے تمام لوگوں نے اس کے لئے اپنے دل کے دروازے کھول دیے۔ اس نور کا ان کے دلوں میں داخل ہونا ہی تھا کہ اس سکون آباد کے لوگوں کی کائنات بدل گئی۔ ان کے دلوں سے ظلمت کے دَل چھٹ گئے۔ وہ خود کے ساتھ ہی عجیب تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان کے جسم سے سیاہ مادہ نکل کر ڈھیر ہو رہا تھا۔ وہ سب سپید، روشن اور چمکدار ہو رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو حیرت واستعجاب سے دیکھنے لگے۔ انہیں اپنے سیاہی کے ڈھیر سے ڈر لگنے لگا۔ وہ یقین ہی نہ کر پاتے تھے کہ یہ کالے سانپ ہمارے اندر تھے۔ انھوں نے راحت کی سانسیں لیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے کائنات کے تمام راز کھل گئے۔ انہیں اپنے آپ سے واقفیت ہوئی۔ انہیں

حقیقی معبود تک پہنچنے کی راہ مل گئی۔ سکون آباد میں شادیانے منائے گئے۔ لوگ ایک دوسرے کو گلے لگانے اور مبارک باد دینے لگے۔

نور ان سے بے انتہا خوش ہوا کہ سکون آباد کے بادشاہ اور رعایا نے ان کا اس طرح شاندار استقبال کیا اور اس کے لائے ہوئے پیغام کو اپنانے میں کسی لیت و لعل سے کام نہیں لیا۔ ان کی اس صفت سے خوش ہو کر نور نے انہیں تسخیرِ کائنات کے کچھ نسخے بتلا دیے تھے۔"

"سن رہے ہو؟"

ناناجی نے زمانے کے ڈھول پر ماری جانے والی ضرب مار کہا تو ان کی آواز فضاؤں میں ضربِ کلیم کی طرح گونجی۔ جس سے ہم اور زیادہ چوکنا ہو گئے۔

"سب یک زبان ہو کر کہنے لگے جی ناناجان سن رہے ہیں۔"

"تو میں کہہ رہا تھا، کہنے والے استاد کہتے ہیں: نور نے ان سے یہ کہا تھا کہ جب تک وہ ان نسخوں کو حرز جان بنالیں گیں، ان کے مطابق اپنی زندگی گزاریں گیں، تب تک کوئی بھی دشمن ان پر غلبہ پا سکے گا نہ ہی سکون آباد میں داخل ہو سکے گا۔ تم کو ہمیشہ صِرف اور صرف اسی نسخے سے تسخیر کیا جائے گا۔ جس دور میں بھی تم اس نسخے کو پسِ پشت چھوڑ دو گے اس میں بتائے ہوئے طرز عمل کو ترک کر دو گے۔ اس میں بتائے گئے اصولوں کے بجائے خود ساختہ یا اغیار کے بنائے ہوئے اصول و قوانین کو اپناؤ گے۔ اسی دن تم سے تمہاری بادشاہت چھینی جائے گی۔ اسی دن تم پر دشمن غلبہ پالے گا۔ تم پر خوف غالب کر دیا جائے گا۔ دشمن کی تلوار مسلط کر دی جائے گی۔ اسی دن سے تمہاری بستی

پر قزاق قابض ہو جائیں گے۔ جو تمہارے مردوں کو قتل کریں گے۔ تمہاری عورتوں کی عزتوں کو پامال کریں گے۔ بچوں کو اپنے نظریاتی سانچے میں ڈھالیں گے۔ پھر تمہاری قوم سے زانی، ڈکیتی، چور، خود غرض، ضمیر فروش، دھوکہ باز، حاشیہ بردار، خویش پرور افراد نکلیں گے؛ جو سکون آباد کا سکون برباد کر دیں گے اور اس کے بعد سکون آباد سکون برباد کہلایا جانے لگے گا۔ وہ اس کو دوسروں کے ہاتھ بیچ دیں گے۔ تمہارے وسائل پر وہی قابض ہو جائیں گے۔ تم اپنی ہی بستی میں غیر سمجھے جاؤ گے۔ اپنے ہی علاقے میں تمہارے چلنے پھرنے پر پابندی لگائی جائے گی۔ تم کو اپنی ہی جائداد سے بے دخل کیا جائے گا۔ تمھیں اپنے گھروں سے نکالا جائے گا پھر ان میں تم کو واپس لوٹنے کی اجازت نہ ہو گی۔ تم انسانیت کے بہت سے حقوق سے محروم کر دیے جاؤ گے۔ تم اس ظلم و تعذیب کے خلاف آواز بھی اٹھاؤ گے مگر تمہاری آواز انصاف کے کانوں تک پہنچ نہ پائے گی۔۔۔

۔۔۔ میری یہ بات اپنی گرہ میں باندھ لو۔۔۔"

کہنے والے استاد کہتے ہیں نور نے یہ بات بہت زور دے کر بڑی سنجیدگی سے کہی تھی،

نانا جی نے بھی بہت سنجیدہ ہو کر کہا:

"۔۔۔ کہ قوموں میں آپس کی نا اتفاقی اور ہدف و منزل کا متعین ہونے کے بجائے الگ الگ ہونا تمام تر زوال کی بنیادی وجہ ہوتی ہے۔ اجتماعی مقاصد کے حصول کے لئے انفرادی مقاصد کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ لوگ اپنے مقاصد میں اس وجہ سے کامیاب نہیں ہوتے کہ سب اپنی اپنی خواہشوں کو پورا کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ ہر کوئی قوم

کے اجتماعی مفاد کو بھینٹ چڑھا کر اپنے اپنے انفرادی تقاضوں کو پورا کرنے لگتا ہے۔۔۔۔"

بادشاہ سلامت نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"کیا تم نے نور کی باتیں غور سے سن لیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے ؟"

لوگوں نے جس کا اقرار کیا۔ بادشاہ سلامت نے ان سے وعدہ لیا:

"کیا اس کے بتائے ہوئے نسخے کے مطابق اپنی زندگی گزارو گے ؟" لوگوں نے اس کا عہد و پیمان کیا۔ یہ بھی ذہن نشین کرایا کہ ہر سابقہ نسل کی ذمّے داری ہے کہ وہ نئی نسل تک مسلسل اس نور کے پیغام کو پہنچائے۔ کئی صدیوں تک سکون آباد کے لوگ نور کے بتائے ہوئے ان نسخوں کے مطابق اپنی زندگی گزارنے لگے۔ تو جو جو وعدے نور نے ان سے کیے تھے وہ سب سچ ہو رہے تھے۔ وہاں ہر طرف انصاف کا دور دورہ تھا۔ لوگ بڑے مطمئن تھے۔ ان کی زندگی بڑے سکون و آرام سے گزر رہی تھی۔ اتنی سکون و آرام سے کہ اسے سکون آباد کا نام ملا۔ یہاں بیمار آ کر شفایاب ہوتے۔ اس میں جہاں وہاں کے قدرتی حسن کا بھی حصہ تھا لیکن انصاف کے نظام کو بنیادی دخل تھا۔ بادشاہ خود کو رعایا کا خادم اور لوگ خود کو اس کے حمایتی سمجھتے تھے۔ دلوں میں کدورتیں نہیں تھیں ۔ سکون آباد کے لوگ امن پسند، سیدھے سادھے ، ایک دوسرے کے خیر خواہ، ایک دوسرے سے محبت کرنے والے ، ایک دوسرے کے ہر دکھ و درد کو اپنانے والے بن گئے۔"

"سو تو نہیں گئے ؟"

نانا جی نے اپنی رعب دار آواز میں کہا۔

"نہیں نانا جان! ہم سب ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے ہیں۔"

اور سب حقیقتاً ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے تھے

"ہاں سنو ——! زمانہ محوِ سفر رہا نور کی تعلیمات کو دھیرے دھیرے نظر انداز کر دیا گیا۔ آئی ہوئی نسل نے آنے والی نسل تک نور کے اس پیغام کو پہنچانا چھوڑ دیا۔ بس رسمی طور پر کبھی کبھی ان کو اُس کی کچھ باتیں سناتے تھے؛ مگر ان کے دلوں سے اس کی عظمت معدوم ہو چکی تھی۔ جن کاموں سے نور نے انہیں منع کیا تھا وہ اب ان میں ملوث ہو گئے۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ وہ بھی آ گیا جب نور کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ ان کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ جو لوگ نور کی تعلیمات کو اب بھی سینے سے لگائے ہوئے تھے ان کو "بوسیدہ زمانے کے فرسودہ لوگ" کا طعنہ دیا جانے لگا۔ ان کی استہزا اور تضحیک کی جانے لگی۔ جب یہ فعل شنیع و قبیح اپنی حد سے تجاوز کر گیا تو نور کے کہنے کے مطابق اس وادی پر قدرت کی طرف سے عذاب کا کوڑا برسا۔ قزاق انہیں لوٹنے کے لئے آ گئے۔ وہ ان کے وسائل پر قابض ہو گئے۔ ان کے گھر ماتم کدے بنا دیے گئے۔ وہ اپنی ہی بستی میں غیر سمجھے جانے لگے۔ جو جو آفتیں نور نے گنوائی تھیں وہ سب آفتیں اس وادی پر نازل ہو گئیں۔ انھوں نے اس کے لئے لاکھوں تدبیریں کی مگر ان کی کوئی بھی تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔ انھوں نے ہر ممکن کوشش کی مگر سب رائیگاں۔ ان کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ جو نسخہ نور نے انہیں بتایا تھا اس کی طرف ان کا دھیان بھی نہ جاتا تھا۔ اب اگر کوئی اس کی طرف ان کا دھیان لے بھی جاتا تھا تو اس پر کان

دھرنے کے بجائے وہ ان میں انگلیاں ٹھونستے تھے۔یوں انھوں نے اپنے لئے ایک دائمی عذاب مول لیا اور اپنی نجات کے تمام راستے بند کر دیے۔"

ناناجی نے کہے جا رہے تھے:

"کہنے والے کہتے تھے !ــــــ ہوا یوں کہ ایک کالی ڈائن اور اس کے لاکھوں بچے اس سکون آباد پر مسلط کر دیے گئے۔جو صرف انسانوں کا گوشت کھاتے اور ان کا خون پیتے تھے۔ان کے پاس ایسے جادوئی آلات تھے جن سے وہ انسانوں کا شکار بآسانی کرتے تھے۔وہ کبھی کبھی ان کو زندہ پکڑ کر بھونتے تھے پھر ان کی بوٹی بوٹی نوچ لیتے تھے۔پھر جب وہ پسماندگان اپنے پیاروں کی تلاش میں نکلے تو کچھ کی ہڈیاں ملیں، کچھ کے سر نظر پڑے، کسی کے جسم کا گوشت سمیٹا، کچھ کی صرف قبروں کی زیارت نصیب ہو سکی اور کچھ آنکھیں ابھی بھی اپنے جگر پاروں کا انتظار کر رہی ہیں۔لہٰذا کئی معصوم یتیم ہو گئے، عورتیں بیوہ ہوئیں، دوشیزاوں کی عصمت کو تار تار کیا گیا۔ضعیف والدین نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے جواں بیٹوں کو نہلایا اور کفن پہنایا۔جو،ان کے ضعیف کندھوں کے سہارے تھے اُن کو ہی اپنے کندھوں کا سہارا دینا پڑا۔یہ سارے مناظر اشکوں سے لبریز، آہوں سے پر زور، نالوں سے پر شور تھے۔ وہ ان کے گھروں کو مسمار کرتے تھے۔انھوں نے سکون آباد میں تباہی مچا رکھی تھی اور کوئی بھی ان کی فریاد سننے والا نہ تھا۔۔۔۔۔ سنتا بھی کون؟ کہ انھوں نے خود ہی اپنی فریاد کے سب دروازے بند کر دیے تھے!!!!!

اب وہ سب انسانوں سے مایوس ہو کر کسی غیبی نجات دہندہ کے منتظر ہیں۔ اس لئے ہر صبح جاگنے کے بعد اور ہر رات سونے سے پہلے ایک مخصوص انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے کچھ دیر کو آسمان کی طرف اپنی نگاہیں اٹھا کے ٹکٹکی باندھتے ہیں۔ جس میں کئی سوالات اور فریاد ہوتی ہے۔ یہی عمل دہراتے ہوئے بہت سا زمانہ گزر گیا اور گزر جائے گا۔ آخر ش جب وہ نور کے بتائے ہوئے نسخے کو پھر سے اپنائیں گے اور اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالیں گے۔ تو پھر ان کی فریاد آسمانوں کو چیرتے ہوئے دربار حق میں پہنچ جائے گی؛ جو ہمیشہ مظلوموں کے ساتھ ہوتی ہے۔ کیوں کہ اُس دربار میں مظلوم کی دعا رد نہیں کی جاتی۔۔۔۔"

ناناجی کہانی کا اختتام کر گئے۔ کچھ دن بعد ان کی اپنی زندگی کا اختتام بھی ہو گیا۔ لیکن وہ کہہ کر گئے تھے کہ "ہم بھی اس کہانی کے کردار ہیں۔"

☆☆☆
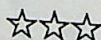
گیارہ 11 سال بعد

خواب ~~~ جذبات ~~~ شعور

ہم عمر کے دو مرحلوں سے گزر کر تیسرے میں داخل ہو چکے تھے۔ ہم پر سماج کی قیود سخت کر دی گئیں تھیں۔ ہم پر نگہ بانی اور نگرانی میں بھی اِضافا ہوا تھا۔ خود ہم میں بھی بہت تبدیلی آچکی تھی۔ کچھ پرانی دوستیاں ٹوٹ کر چند نئ استوار ہو چکیں تھیں۔ ہم معصومیت کے حصار سے نکل کر معصیت کی سرحدوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اخلاص و محبت کے دائرے سے گزر کر خود غرضی و نفرت کے دائرے میں آچکے تھے۔ جزب و مستی کی دنیا کو رخصت کر کے جذبات و شعور کی وادیوں میں داخل ہو چکے تھے۔ بے خبری کے عالم سے نکل کر عالم حواس میں پہنچ چکے تھے۔ رات کی مست نیند سے بیدار ہو کر چکا چوند صبح میں آچکے تھے۔ خواب کے حسین مرغزاروں سے ہو کر حقائق کے سنگلاخ جنگلات میں پھنس چکے تھے۔ ہمارے ماضی کی وہ دنیا اب حال کی وجہ سے بہت بدل چکی تھی۔ "پہلی وردی کی خوشبو" سے لے کر "یمّوو دلو" کا تجربہ فرحت بخش اور راحت افزا تھا۔ مگر "خواب، جذبات اور شعور" کا یہ مرحلہ بہت کٹھنائیاں اور مشکلات لے کر آیا۔ آسیہ ـــــ، صہیب، خالد، لیلیٰ، صبا، سیرت، مدثر، حسیب، سب گویا میرے لئے اجنبی بنتے جا رہے تھے۔ لیلیٰ، صبا اور رقیہ کی تو شبیر، مدثر اور ساجد کے ساتھ شادی بھی ہو چکی تھی پر میرے دل میں اب بھی ان کے ساتھ کھیلنے کے ارمان شدت سے مچلتے تھے۔ چار و ناچار مجھے بھی ان کا ساتھ دینا پڑا! اور

عمر کے اس موڑ کو وہیں چھوڑ کر اپنے پیچھے ـــــــ اور آگے نکل جانے کے لئے قدم اٹھائے، جو اٹھے مگر لڑکھڑائے، ڈگمگائے، گرے، گرتے گرتے آخرکار سنبھل ہی گئے۔ اپنے بچپن کو چھوڑنا یا ماضی کو بھلا دینا کتنا سخت مرحلہ ہے !!!

آسیہ ـــــ کا داخلہ "جامعۃ العلوم" میں کیا گیا تھا جو شہر میں تھا۔ لہٰذا اب وہ اپنی تعلیم میں منہمک ہو گئی تھی۔ اب وہ پردے کا بہت زیادہ اہتمام کرتی تھی۔ اس کی عبادتوں اور ریاضتوں میں بھی بہت اِضافا ہو گیا تھا۔ مجھے آسیہ ـــــ کے اس ردعمل پر تعجب تھا کہ اب وہ مجھ سے بات کرنے سے شرماتی تھی۔ میں جب عائشہ چاچی اور شاہد سے ملنے ان کے گھر جاتا حسب معمول آسیہ ـــــ کے بارے میں پوچھتا پر وہ میرے سامنے آنے سے بہت حد تک کتراتی تھی۔ مجھے اپنی کم مائیگی کے باوجود آسیہ ـــــ کے غیر معمولی ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں مُتاثِّر ہونے کے علاوہ ان سے مرعوب بھی ہو رہا تھا؛ حتیٰ کہ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ راستے میں آسیہ ـــــ ملی پر میں اس سے بات کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ یوں اپنے گانوؤں سے پڑھائی کے سبب دور رہنے کی وجہ سے روز بروز آسیہ ـــــ اور میرے درمیان دوریاں بڑھنے لگیں۔

آسیہ ـــــ جب پڑھائی سے فارغ ہوئی تو اس نے گانوؤں کی لڑکیوں کے لئے چند سہیلیوں کی معاونت سے اپنے گھر میں ایک مکتب اور اسکول کھولا۔ اس میں دس سال تک کی عمر کے لڑکوں کو بھی آنے کی اجازت تھی۔ جہاں ان کو قرآن وحدیث کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ عصری علوم اور جدید تقاضوں سے بھی واقف کرایا جاتا تھا۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانیں بھی سکھائی جاتی تھیں۔ بچوں کے لئے سفید

قمیص شلوار اور ٹوپی وردی منتخب ہوئی تھی۔ لڑکیوں کے لئے پردہ لازمی تھا۔ صفائی ستھرائی کا خاص لحاظ رکھا جاتا، دانت، کان، ناک، بال، ناخون اور کپڑوں کا گندھا ہونا اسکول کے ضوابط سے روگردانی سمجھی جاتی اور ایسا کرنے والے کو بطور تنبیہ کے سزا بھی ملتی۔ وہ بچے جب آسیہ — کے ہاں پڑھنے کے لئے جاتے تو ان کو دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا کہ ہمارے گانوؤں میں اسلام کی بہار آئی ہوئی ہے۔ اور بستی میں ان بچوں کی صورت میں آسمان سے ننھے منے فرشتے اترے ہیں۔ جن لوگوں کو حقیقی صورت حال اور اس کے تقاضوں سے واقفیت نہ تھی وہ بھی اس ماحول سے بہت خوش تھے۔ آسیہ — تو پوری بستی کی نور نظر بن گئی تھی۔ اس کی وجہ سے اس میں صحیح معنوں میں "اسلامی انقلاب" آیا تھا۔ بڑی عمر کی کئی لڑکیوں حتٰی کی شادی شدہ عورتوں کے شوق اور دینی حمیت نے بھی انگڑائی لی اور اپنا وقت فارغ کر کے وہ بھی ہفتہ واری درس میں شرکت کرنے لگیں۔ ان کے معاملے میں آسیہ — بہت رعایت برتتی، وہ ان کے آنے کو ہی بہت غنیمت جانتی تھی۔ ان کے لئے آسان سانسخہ یہ تجویز کیا تھا کہ جس کو کچھ بھی قرآن یاد نہ ہو اس کو قرآن کی دس صورتیں صحیح مخرج کے ساتھ یاد کراتی اور بزرگ (بوڑھی) عورتوں کو کم سے کم چار صورتیں مع سورہ فاتحہ۔ اس کے علاوہ ایمان مفصل، ایمان مجمل، چھ کلمے، غسل، وضو، نماز، روزہ، زکوۃ، حج، نکاح، معاملات، اخلاقیات، معاش اور معاشرت کے اہم مسائل سے بھی ان کو آگاہ کرتی تھی۔ ایک سال کے بعد آسیہ — کی کامیابی کے لئے یہی بہت کافی تھی کہ بستی کے بہت سے مرد

خواتین نماز کے پابند ہو گئے، بہت حد تک پردہ بھی زندہ ہو گیا تھا اور سب سے بڑی

بات یہ تھی کہ انہیں زندگی گزارنے کا صحیح شعور حاصل ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عورتوں میں دین داری داخل ہوگئی تھی۔ عورتیں بڑے ہی انہماک و اہتمام سے اسلامی اعمال کو خود بھی بجالاتیں اور اپنی اولاد کو بھی اس پر کاربند بناتیں تھیں۔ مردوں کو تو کوئی چارہ نہ تھا۔ میں جب چھوٹے چھوٹے بچوں کو آسیہ —— کے ہاں جاتے ہوئے دیکھتا تو میرے دل میں شدت سے یہ تمنا جاگتی تھی کہ کاش میں بھی ان ہی جیسا ایک چھوٹا بچہ ہوتا جو کہ آسیہ —— سے فیض پاتا۔

میرے اکثر دوستوں کے نکاح ہو چکے تھے۔ اب مجھے بھی اس بندھن میں جکڑنے کی فکریں گھر والوں کو ستا رہیں تھیں۔ میرا ارادہ مزید پڑھائی کا تھا، اس لئے کچھ دنوں تک میں ابو اور امی کے کہنے کو ٹالتا رہا۔ ایک دن ابو نے قدرے ناراضگی کے لہجے میں کہا:

"آخر کیا بات ہے، تم نکاح کیوں نہیں کرنا چاہتے؟"

"ابھی میں پڑھائی مکمل کرنا چاہتا ہوں"

"تو اسے چھوڑنے کے لئے کون کہتا ہے؟"

"دیکھو بیٹا! جب بچے بالغ ہو جائیں تو ماں باپ کو ان کے نکاح کی فکر سب سے زیادہ ہوتی ہے ساتھ ہی یہ ان کا بہت بڑا ارمان بھی ہوتا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ تم اس وقت میری باتوں کو نہیں سمجھ سکتے مگر جب زندگی خود تمہیں اس مرحلے تک لے جائے تو اس وقت میری بات تمہاری سمجھ میں آئے گی۔ لہٰذا ہمارے معاشرے میں یہی مناسب سمجھا گیا کہ جو باتیں چھوٹوں کو اس وقت سمجھ میں نہ آئیں ان کا فیصلہ بڑے ہی کرتے ہیں۔"

"میں آپ کے فیصلے کے خلاف نہیں ہوں، آپ کا ہر فیصلہ میرے سر آنکھوں پر، میں تو صرف آپ سے ڈیڑھ سال کی مہلت چاہتا ہوں۔"

"مجھے بھی آپ سے فرمانبرداری ہی کی توقع ہے مگر ڈیڑھ سال تک میرا بوجھ بہت بڑھ جائے گا، آپ کے بھائی اور بہن کے متعلق بھی تو سوچنا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ بہن عائشہ ہماری وجہ سے مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ آسیہ جیسی لڑکی کے لئے ہر باپ کوشش کرے گا کہ وہ ان کے گھر کی بہو بنے۔"

آسیہ ———— "آسیہ —— کا نام سنتے ہی میرا دماغ چکرانے لگا۔

"ابا یہ آپ کیسی بات کرتے ہیں؟"

"کیوں تمھیں اس رشتے سے انکار ہے؟"

رشتے سے انکار --- رشتے سے انکار! میں سوچ میں پڑھ گیا۔ کیا مجھے رشتے سے انکار ہے؟ کیا آسیہ ——، آسیہ —— کے ساتھ رشتے سے انکار ۔ کیا آسیہ ——!!! ایک ہاں سے آسیہ —— ہمیشہ کے لئے میری زندگی میری روح میں تحلیل ہو جاتی اور ایک انکار کی وجہ سے ہمیشہ ہمیش کے لئے مجھ سے جدا ہو سکتی تھی۔ کیا میرے لئے آسیہ —— کو خود سے دور کرنا ممکن تھا؟ ان راستوں کو اب بھی میں تکا کرتا تھا جہاں سے آسیہ —— اور میں بچپن میں چلا کرتے تھے، ان کھیتوں میں اب بھی میں اکثر جایا کرتا تھا جہاں ہم ساتھ ساتھ کھیلتے تھے، اس سے جیتے ہوئے کنچوں، چوڑیوں کے ٹکڑوں اور ٹینچوں اور پیتل کے چھلوں کو میں نے اب بھی سنبھال کے رکھا ہوا

تھا۔ آسیہ — کے ساتھ میرا یہ کیسا غیر شعوری مگر اتنا شدید اور مضبوط تعلق تھا؟ پھر بھی میں نہ جانے کیوں ان کے ساتھ شادی کے اس لفظ کو سن کر چکرا گیا تھا؟

"ابا آپ مجھے کچھ دن کی مہلت دے دیجیے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا! مگر میری ایک بات یاد رکھنا۔ زندگی میں سنہرے موقعے بار بار نہیں آتے! اللہ تبارک و تعالیٰ تو ہر وقت انسان پر مہربان و فیاض ہی رہتے ہیں؛ مگر کبھی کسی کو نوازنے کے لئے کچھ مخصوص مواقع بھی فراہم کرتے ہیں! اگر ان مواقع اور فیصلوں کی قدر کر کے ان کو اللہ کی طرف سے نعمت سمجھ کر مناسب وقت پر مناسب فیصلہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ انسان کو مزید نوازتے ہیں اور اگر مناسب وقت پر مناسب فیصلہ نہ کیا جائے، وقت تو بہر حال گزر جاتا ہے اس کے ساتھ تقدیر کے فیصلے بھی گزر جاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ تم میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔"

میں یونیورسٹی چلا گیا وہاں دوستوں سے مل کر طبیعت خوش ہوتی تھی۔ پر آج جانے کیوں مجھے ساری محفل بجھی بجھی سی معلوم ہوئی؟ فضا میں جیسے اداسی چھائی ہوئی تھی! میرے دوست معراج، ارشاد، گوہر اور حفیظ نے مجھ سے میرے لہجے کی شکایت بھی کی مگر میں نے اَن سنی کر دی۔ پڑھنے کا بالکل بھی من نہ کرتا تھا۔ اس لئے میں دل کے بوجھ کو کم کرنے کے لئے چنار کے سایے میں بیٹھ گیا۔ میں ابو کی بات سے سوچ کی گہرائیوں میں ڈوب گیا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتے ہے کہ میں آسیہ — --! نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔--! آسیہ — وہ -- وہ -- آسیہ —، آس — راس -- راس -- آس —، راستہ -- آسیہ — آسیہ —، راستہ -- آراستہ — آراستہ — آہستہ — آہستہ --

آسیہ ------ --- --- ----- --- -- میری سوچ اس وقت سیمابی بن گئی، کبھی پارہ اِدھر، کبھی پارہ اُدھر! بہت غور و فکر کے بعد یہ ایک ہی صورت سوجھی کہ میں آسیہ ـــ سے اس بارے میں بات کروں۔ کیونکہ آسیہ ـــ ہی مجھے بہتر طور پر سمجھ سکتی تھی، وہی میرے حوصلوں کو جلا بخش سکتی تھی، میرے ارادوں کو مضبوط کر سکتی تھی۔ مجھے ان سے امید تھی کہ وہ میرا ساتھ ہر مشکل موڑ پر دے گی۔ میری کامیابی گویا اُسی سے جڑی ہوئی تھی۔ میرا ایقان اس کے متعلق تھا کہ وہ ایک پیکرِ نور ہے جو مجھ سے بڑھ کر دلداری کا مظاہرہ کرے گی۔

سنیچر کو گھر آ کر میں نے ابا کو اپنا فیصلہ سنایا تو انھوں نے مجھ سے خوش ہو کر بے پناہ محبت کا اظہار کر کے مجھے اپنے گلے لگایا۔ امی، بھائی، بہن کی تو خوشی کی انتہا نہ تھی کہ انہیں آسیہ ـــ جیسی بہو مل رہی تھی۔ اس وقت مجھے آسیہ ـــ پر اور بھی زیادہ رشک آ رہا تھا۔ اس کی وقعت میرے دل میں اور بھی بڑھ گئی۔ کچھ دنوں کے بعد شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ دونوں گھروں میں بڑی ہل چل اور خوشی کا سماں تھا۔ نکاح کے دو دن بعد رخصتی تھی۔ اس کے اگلے دن ولیمہ تھا۔ ہم نے اپنے مکان کے پیچھواڑے میں "وُرِ" لگائی، یعنی کھانا پکانے کا بندوبست کیا تھا۔ اپنے محلے کے لوگوں کے علاوہ رشتہ داروں اور دوستوں کی دعوت تھی۔ وہ "سال" کھانے سے زیادہ کام کرنے کے جذبے سے آتے تھے جو کہ ہماری ثقافت کا بہت ہی پائیدار ستون تھا۔ محلے کے نوجوان ایک دوسرے کو ہنسانے کے لئے لطیفہ بازی بھی کرتے تھے۔ منہدی رات جیسی غیر مہذبانہ رسم نہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کو اس دن جمع ہونے کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے کچھ

مجھ سے روٹھی تھیں۔ کچھ دعوت میں شریک نہیں ہوئی تھیں لیکن باقی گھر والوں کو بھیجا تھا۔ بعد میں جب ہماری ناراضگی، دور ہوئی، میں ان کو چڑھاتا تھا کہ اب کیا فائدہ "سال" ہاتھ سے گیا۔ گانوؤں کی بڑی بوڑھیوں کی عادت بچپن سے ہمارا ماتھا چومنے اور ہمیں گلے لگانے کی تھی۔ ان میں اکثر دار آخرت کو کوچ کر چکی تھیں، کچھ چلنے پھرنے سے قاصر تھیں مگر جو زندہ تھیں وہ اس رسم کو پابندی سے نبھا رہیں تھیں۔ وہ آج مجھے مبارک باد دینے کے بہانے میرا ماتھا چومنے اور گلے لگانے کے لئے آئیں تھیں۔ آنگن میں مدثر کی چھوٹی بیٹی ادیبہ جو میری بھی گود میں پلی تھی توتلی زبان سے ہاتھ بجا بجا کر ایک خوب صورت کشمیری گیت بڑی پیاری آواز میں گا رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی سہیلیاں اس کے تعاقب میں وہی بول دہرا رہی تھیں؛ جیسا کہ ہمارے ہاں شادیوں پر اس کا رواج رہا ہے۔ میں ادیبہ کے گیت کے الفاظ کی گہرائی میں سوچ کی پر پیچ راہوں میں کھو گیا تھا۔ اس میں عمر کے مراحل کو کس طرح ایک ہی کڑی میں موتیوں کی طرح پرو یا گیا تھا! بس چہرے بدل جاتے ہیں الفاظ، خیال، انداز، جلوے، جذبات، احساسات، کیفیات تو وہی رہ جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے یہاں، میں، آسیہ — رقیہ، صبا، خالد، شبیر، صہیب ہوتے تھے۔ اب ہماری جگہ فاطمہ، حفصہ، مہوش، آنیہ، طیبہ، مہک، عطوفہ، جبران، ہبان، زید، ساجد، ضمیر، کامران نے لے لی ہے۔ ہم سے پہلے بھی کوئی اور تھے اور ان کے بعد بھی کوئی اور آئیں گے۔ تب یوں ہی ان کے لئے بھی گیت گائے جائیں گے۔ پھر میری طرح کوئی رک کر، کان لگا کر ان کو سنے گا اور ماضی کی یاد اس کے پانوؤں کو شل کردے گی!

شام تک سب مہمان کھانے سے فارغ ہو گئے اور مجھے تھوڑی دیر آرام کرنے کو ملا۔
آج آسیہ ــــــ اور میں سماج کی قیود سے گزر کر ایک دوسرے کے قریب -- بہت قریب تھے۔ یہ خیال مجھے جتنی تسکین بخشتا تھا اس کو بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ تھے نہ انداز۔ میں کمرے میں سلام کر کے داخل ہوا تو اماں، بہن، خالہ، بوا، ممانی، تائی اپنی پیاری بہو کو گھیرے میں اس طرح لئے ہوئے تھے جیسے وہ کوئی دلھن نہیں بلکہ مجرم ہو۔ ہر کوئی اس سے پیار کرنے، باتیں کرنے کا خواہاں تھا۔ لہٰذا دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ہنسی کی فواریں اڑ رہی تھیں، قہقہوں کے آبشار گر رہے تھے۔ آسیہ ــــ کی تکلیف کے خیال نے انہیں جانے کے لئے مجبور کیا، ورنہ وہ اس کے پاس سے جانے کو تیار نہ تھے۔

زہر القا، زیبا طلعت؛ آسیہ ــــــ پھولوں کی سیج پر، پریوں جیسی حسین، حوروں جیسی پاکیزہ لگ رہی تھی۔ اس کی موجودگی سے سارا گھر مہک رہا تھا، میرا وجود مہک رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ آسیہ ــــ آج گلشن کے سارے پھول پہن کے، عطر و عنبر میں ڈھل کے، چاندی مل کے اور تاروں سے سج کے آئی ہے۔ وہ گویا ستاروں میں چاند معلوم ہوتی تھی۔ آسیہ ــــــ اور میں نے، خود کو اتنا قریب دیکھنے کا خواب کہاں دیکھا تھا؟ کہ آج مقدر نے اس خواب کی تعبیر پوری کر دی۔ اس کی موجودگی سے میں اپنے خوابوں میں زندگی بھر رہا تھا۔ ہم دونوں کبھی بھی ایک دوسرے سے اس طرح نہیں شرمائے تھے؛ لیکن آج شرم کی کئیں لکیریں ہمارے چہروں پر امڈ آئیں تھیں۔ قربتوں کے باوجود جیسے برسوں کی دوریاں ہمارے درمیان حائل ہو گئیں

تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ اجنبی! اور آج پہلی بار سامنا ہو رہا ہے! اس لئے اب کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا کہ بات کیسے کی جائے، کن الفاظ سے شروع کی جائے، پہل کون کرے؟ شرم اور ڈر کے مہیب سایے درمیان میں لہرا رہے تھے۔ میں نے تو کسی قدر اپنے حواس پر قابو پا کر بات کرنے کی کوشش کی پر الفاظ میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ آسیہ —— اپنے وجود میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ اس کی خاموشی جیسے کئی افسانے بکھیر رہی تھی اور میرے دل میں بسے ہوئے نغمے اپنے تاروں میں درد کے ساز بھر رہے تھے۔ شرم سے اس کی نگاہیں پردے کی اوٹ میں جھکی ہوئیں تھیں۔ اس کو اپنی سانسوں کا شمار نہیں تھا۔ تیز تر رفتار سے دل کی دھڑکنیں انہیں حرارت پہنچا رہیں تھیں۔ آسیہ —— بھی تو وہی کچھ سوچ رہی تھی جو میں سوچ رہا تھا کہ اجنبیت کی اس دیوار کو کیسے توڑا جائے؟ میں نے ایک رس بھرا -- سریلا -- محبت کی لطافتوں -- اور خلوص کی صداقتوں -- سے لبریز لفظ - آسیہ —— پکارا۔ جو میرے پاس ---- ایک ایسے وجود کی صورت میں سامنے تھی جس کے حصول کی سعادت میری زندگی کی سب سے بڑی سعادت تھی۔

"جی!"

میری زبان سے اپنا نام سن کر آسیہ —— کے ٹوٹے ہوئے ارادوں کو ہمت مل گئی، اکھڑتے ہوئے قدموں کو سہارا مل گیا، لڑکھڑاتی ہوئی زبان کو گویائی نصیب ہوگئی۔ جس کی وجہ سے ان کی زبان سے بھی بے اختیار میرا نام نکلا "ہادی

——!"

"کہیے کیا کہنا ہے۔"
اس انداز میں محبت کی تمام نازک خیالیاں لبریز تھیں اور عشق کی تمام تر رنگینیاں در آئیں تھیں۔ میں وفورِ جذبات سے گویا اپنی سانس لینے اور زندگی سے ہی بیگانہ ہو گیا تھا۔ہم میں یکسر یہ کیسی تبدیلی آگئی تھی ؟ اس قربت سے ہم دونوں کے درمیان اجنبیت اور تکلفات کی یہ دیوار کیوں حائل ہو گئی تھی؟ کیا ہم اب وہ عبد الہادی— اور آسیہ — نہیں رہے تھے ؛جو ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے تھے ، اس بنا پر کبھی کبھی ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے مگر تین دن سے زیادہ کی جدائی برداشت نہ کرتے تھے۔ہاتھوں میں ہاتھ دے کر گیت گاتے تھے۔ جس کو میں تتلیاں پکڑ کے دیتا تھا، جو پیچھے سے آکر میری آنکھوں پر اپنے نرم گداز ہاتھ رکھتی تھی، تاک میں بیٹھ کر مجھے دھکا دیتی دی تھی، مجھ سے بانٹے چراتی اور میں اس کی چوڑیاں لے جاتا تھا، جو برف سے میرے مجسمے بناتی تھی۔ ہم تو وہی تھے یہ دنیا بھی وہی تھی یہ گھر بھی وہی تھا، بستی بھی وہی تھی آنگن بھی وہی تھا، کھیت بھی وہی تھے، تتلیاں بھی وہی تھیں، پھر کیا چیز بدلی تھی ———؟ وقت ! ہمارا رویہ ! ہمارا انداز !ہماری عمر کے مراحل !ہمارے تعلق کی نوعیت ! یہ بھی تو اس کی وجہ بن رہی تھی کہ ہم خواب کو حقیقت میں بدلنے کا مظاہرہ کررہے تھے۔پر ابھی ہمیں قدرت کے اس فیصلے پر یقین نہیں آرہا تھا۔انسان کے ساتھ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ جس چیز کو پانے کا ارمان شدت سے ہوتا ہے اسے پاتے ہوئے پھر اسے یقین نہیں آتا۔وہ یقین کو بھی یقینی جانے کے لئے حواس پر اچھی طرح سے قابو پانے کے لئے کچھ مہلت مانگتا ہے؛ تاکہ خواب اور

حقیقت کے درمیان اچھی طرح امتیاز کر سکے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خواب ہو، محض وہم ہو اور پتہ چلنے پر اس کی کرچیاں ہر طرف بکھر جائیں۔ اس لئے اس سے پہلے ہی اس کو ٹوٹنے سے بچایا جائے تاکہ ان کرچیوں سے دل اور روح زخمی نہ ہو اور اگر یہ حقیقت ہے تو اپنی قسمت پر کچھ دیر کے لئے ناز کرے۔ یہی کیفیت، یہی حالت اس وقت میری اور آسیہ ــــــ کی تھی۔ آسیہ ــــــ کے دل کی کیفیات جاننے کے لئے میں نے خفیف سی آواز میں ان سے کہا:

"ہم یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ حقیقت ہے؟"

"میں خود بھی اس کا فیصلہ نہیں کر پاتی ہوں؟"

"مگر ایک بات بتاؤں؟"

"کیا؟"

"یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔"

"مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔"

"آسیہ ــــــ میں اس بات پر حیران ہوں کہ تم میری روح میں کیسے تحلیل ہو چکی ہو؟ مجھے اپنا اور تمہارا وجود ایک ہی لگتا ہے۔ تم لمحہ لمحہ مجھے اپنی قربت کے جال میں جکڑ رہی ہو۔ میرے لئے زندگی دشوار تر ہوتی جا رہی ہے۔"

وہ رنگین شام آسیہ ــــــ کی آمد سے قوسِ قزح بن گئی تھی۔ اس حسین نازک کلی کی وجہ سے میری زندگی کے گلشن میں بہار آ گئی تھی۔ اِس کے پھیکے پن میں شیرینی شامل ہو گئی تھی۔ ہر نظر مجھے نظارہ لگتا تھا۔ ہر کلی پہ پھول کھلے ہوئے محسوس ہوتے۔ میری جلوت

اور خلوت دونوں میں اس کی موجودگی سے ایک نئی روح ودیعت کر گئی تھی۔ ہمارے گھر، آنگن میں گویا ایک عجیب ہی رونق وقوع پذیر ہوئی تھی۔ ابو، امی، بھائی، بہن سب بہت خوش تھے۔ رشتے دار، دوست واحباب کی مبارک بادیوں کا سلسلہ چل نکلنا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ خوشیوں کا ایک نیا جہاں آباد ہو گیا ہے؛ جس میں اب غم کا گزارہ نہیں ہو گا۔ لیکن اس کا دوام ممکن نہیں تھا۔ روز بروز میری بے قراریوں میں اِضافا ہو رہا تھا اور میری پریشانیوں کا گراف بڑھ رہا تھا کہ کیسے میں آسیہ ـــــ ـ ـ ـ!

بہر حال ایک رات دل پر پتھر رکھ کر ہمت کر کے میں نے داستانِ غم چھیڑ ہی دی۔

"آسیہ ـــــــــ میرا دل ایک سمندر ہے۔ جس کی تہہ میں کئی راز پوشیدہ ہیں۔ جو میں تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتارنا چاہتا ہوں؛ تاکہ ان گہرائیوں میں وہ محفوظ رہیں۔ ـ ـ ـ ـ

"عبدالہادی! میں آپ کے کسی کام آؤں، اس سے بڑھ کر میرے لئے سرفرازی اور کیا ہو سکتی ہے؟"

"آسیہ ـــــــــ می، میں، میں ں تمہارا اعتماد چاہتا ہوں!"

اس کے دل سے بے تاب ہو کر ایک چیخ نکلی! جو میرے نام کے ساتھ ہوا میں بڑے زور سے گونجی ـــــ عبدالہادی!!!!!!!!!!!

ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟!!!!!!!!!!!!!!!!!!!!!!!!!!!

اِس جملے نے اُس کے حسین خوابوں کی ساری کائنات ہی ملیامیٹ کر دی۔ اُس کے درمیان ایک وسوسہ اور شوشہ چھوڑ دیا۔ یہ الفاظ نہیں زہریلے نشتر تھے! جو اُس کے

سارے وجود میں چُبھ گئے۔ گویا اُس کا انگ انگ چھلنی ہو گیا اور اب ان سے خون رِس رہا ہو۔

"آس ـــ! تم خاموش کیوں ہو گئیں، میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں؟"

یہ سنتے ہی اُس کی نرگسی آنکھوں سے بے ساختہ آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا۔

"ہاد ـــ میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں؟

اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ میرے وعدے کی اوٹ میں چھپے سوال کو جان گئی تھی۔ کیونکہ اس پرستان میں وعدوں کی ڈوری میں بندھی ہوئیں، انتظار کی مالاؤں میں پروئی ہوئیں آسیہ ـــــ جیسی کئی دلھنیں، شہزادیاں اور پری زادیاں تھیں۔ جن کے لمحوں کے گلو میں عبد الہادی ـــ جیسے دولھے، شہزادے اور پری زادے وفا کی یہ مالائیں پہنانے کا وعدہ کر گئے تھے اور بہار آنے پر آنہیں اپنے ساتھ لے جانے کا وعدہ دے کر گئے تھے؛ مگر وہ کبھی وعدہ -- وفا۔۔۔! آسیہ ـــ کا اضطراب یوں ہی تو نہیں تھا۔ اُس نے تو میرے حواس بھی گم کر دیے تھے؛ مگر میں نے اپنی بات جاری رکھی:

"ایک سوال ہی تو کیا ہے۔ تم اس طرح سے کیوں ہلکان ہو رہی ہو؟"

"اپنی آنکھوں سے بھی یہی سوال کرو، وہ کیوں آنسو بہا رہیں ہیں؟"

"آسیہ ـــــ ان آنکھوں کی تقدیر میں ہی آنسو لکھے ہیں۔ ان آنسوؤں کا در بند کرنے کے لئے ہی میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں؟"

"ہاد ـــــ مقاصد کی الفت میں یہ بے تابی؟"

"ہاں آس ——— ہاں۔"

"عبدالہادی ——— عبدالہادی ——— ہائے عبدالہادی۔"

"آسیہ ——— آسیہ ——— مجھے اور نہ رلاؤ۔"

"عبدالہادی ———"

آنسوؤں سے آسیہ ——— کی گھگھی بندھ رہی تھی۔ اُس نے اپنے نازک ہاتھوں میں میرے ہاتھ لیے۔ اِس لمس نے مجھے عجب ہی احساس سے دوچار کر دیا۔ محبت کا دلپذیر آشنا جذبہ ۔میرا ذہن روح کی گہرائیوں میں اترنے والی اِن حسین کیفیات میں بہہ گیا۔۔۔!!!

ہمارے درمیاں اِس "اضطراب شوق نے حشر برپا کر دیا" تھا۔ میں نے اُن نازک ہاتھوں کو چوم کر اپنی آنکھوں سے لگایا۔

ہچکیوں کی قطار بندھ رہی تھی، آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔

"عبدالہادی مجھ سے اور زیادہ امتحان نہ لو۔۔۔۔۔ اتنا بوجھ مجھ پر مت ڈالو جس کو میں اٹھا نہ سکوں،،،، میں اٹھانے کی کوشش بھی کروں تو میری کمر ہی ٹوٹ جائے۔۔۔۔ ہادو ——— ہادو، ہادو۔

زور دار گرج کی آواز کانوں میں پڑنے کے علاوہ بجلی کی تیز روشنی اُس کی آنکھوں سے بہت تیز گزر کر چلی گئی؛ مگر وہ آسمان سے نازل نہ ہوئی تھی بلکہ اُس کے وجود سے ابھری تھی۔ اُس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی صحرا میں تنہا، اکیلی کھڑی ہے جہاں

دور دور تک کوئی سایا بھی نہیں ہے۔ کسی انسان، جانور نہ کسی درخت کا۔ اُس کی زبان گنگ ہو گئی، لڑکھڑاتے لفظوں سے، بجھی بجھی سی آواز میں افسردہ لہجے سے بس اتنا کہا:

"تو پھر یہ ملن کیسا"؟!!!!!؟

درد کی ساری تاثیر اس میں سمٹ آئی تھی۔ جس نے میری شریانوں تک اپنے نشتر چبھو دیے۔ مجھے لگا شاید میں اِس کاری وار کو برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ اُس وقت مجھے زبان اور الفاظ کا وار سمجھ آرہا تھا کہ وہ کیسے خنجر اور تلوار سے بڑھ کر پُر درد اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اُس کے نشتر تو ابھی تک میرے جسم میں پیوستہ ہیں کہ کیسے میں نے پھول جیسی نازک آسیہ —— کا نازک دل توڑا؟

"میں اپنے وجود کو لافانی بنانا چاہتا ہوں!"

"مگر میرے وجود کا کیا بنے گا؟ میرے خواب تو تم ہی سے شروع ہوتے ہیں اور ان کی تعبیریں تم پہ ہی ختم ہوتی ہیں۔ ان کا کیا بنے گا؟"

"خود میرے پاس بھی اس سوال کا جواب نہیں ہے۔ آسیہ —— میں تم کو کھونا نہیں چاہتا، تم سے دور نہیں رہنا چاہتا، تمھیں لگتا ہے کہ میں تمہاری جدائی کے صدمے کو برداشت کر پاؤں گا؟ مجھے تو اِس خیال سے ہی وحشت ہوتی ہے، یہ سوچ کر ہی ڈرتا ہوں، میرا دم گھٹنے لگتا ہے، سانسیں پھولنے لگتیں ہیں، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے، مجھ پر کیا کیا قیامتیں ٹوٹ پڑتیں ہیں۔۔۔۔۔ مگر،،، میں کیا کروں، کیا کر سکتا ہوں؟ کہ ہر حال میں جدائی ہمارا مقدر ہے!"

آسیہ —— تم ہی ایک ایسی ہستی ہو؛ جو مجھے حوصلہ دے سکتی ہے؛ میری ڈھارس باندھ سکتی ہے، میرے عزائم کو تازہ کر سکتی ہے، میرے ارادوں کو استقلال بخش سکتی ہے، میری استقامت اور ثابت قدمی کی دعا کر سکتی ہے۔ تمہاری دینی تربیت، اعلیٰ سوچ، ارفع مقاصد اور پاکیزہ جذبات نے مجھے کسی اور کے متعلق سوچنے سے روکا، اگر کبھی کسی کا خیال دل میں گزرا بھی تو میں نے فوراً اپنی نظریں ان سے ہٹا دیں۔

"ہ ہ ہ ہا ہا د ہا د د!!!!!!!!!!!!!!!!"

آسیہ —— نے اپنا دوپٹا منہ میں دباتے ہوئے، کہ چیخوں کا سیلاب ضبط کے بندھ توڑنے میں مصروف تھا۔ کچھ کہا بھی نہیں جاتا، چپ رہا بھی نہیں جاتا۔ بہت سی باتیں کہنے، سننے میں معمولی لگتی ہیں، مگر ان کا دھچکا بہت زور دار ہوتا ہے، انسان کا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ سوچ کام کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ پانوؤں لڑکھڑا جاتے ہیں، سارے جسم میں لرزاں طاری ہو جاتا ہے۔ سانس تو چلتی رہتی ہے مگر حقیقت میں زندگی کے سارے آثار معدوم ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ ایک زندہ لاش ہوتی ہے جس سے صرف آہستہ آہستہ سانس آتی رہتی ہے مگر باقی سارے حواس و اعضا معذور ہوتے ہیں۔ آسیہ —— اسی نقشے کی ایک تصویر بنی ہوئی تھی:

"ابو کے چلے جانے کے بعد میں نے اپنی خوشیوں کے خواب تم سے منسوب کیے تھے۔ پر میری خوشیوں کے یہ لمحے، بس چند لمحے -- بس چند دن -- تھے۔ میں نے یہ مانگا تھا مگر اتنا مختصر نہیں:

وصل کا دن اور اتنا مختصر

دن گنے جاتے تھے اس دن کے لئے

ہِیک،ہ ہ ہاد ہا ہاد!۔۔۔۔۔۔میں کب سے اس دن کے لئے دن گن رہی تھی، میری کئی راتیں، کئی صبحیں، کئی شامیں کیا اسی دن کے دیکھنے کے لئے ترس رہیں تھیں۔ تم تو کہہ رہے تھے ہمارا ملن حقیقت ہے۔ یہ سب تو خواب و سراب معلوم ہو رہا ہے!"

"ہ ہادو و۔۔۔۔۔۔ تم نے تو کہا تھا کہ چند سال ۔۔۔ ! پھر جلد بازی۔۔ وجہ۔؟ ابھی سے المناک کہانی کا آغاز۔۔!"

"آس۔۔۔ تم بھی نادان بن رہی ہو جس گلستان کے ہم پروردہ ہیں کیا اس میں ہمیشہ بہار ٹکتی ہے؟ یوں آتی ہے یوں جاتی ہے پتہ ہی نہیں چلتا کب آئی؟ کب چلی گئی۔ میں نے تم سے جو کہا تھا ٹھیک کہا تھا لیکن گلستان کی ہواؤں نے اپنا رخ ہی موڑ دیا۔ ورنہ میں آپ سے کئے گئے وعدے پر کاربند ہوں۔ صبر ۔۔۔صبر ۔۔۔انتظار۔۔۔انتظار۔"

"جب، (ہِک) ج۔۔ب۔۔۔۔ جب، تم نے یہ فیصلہ خود ہی کر لیا ہے، تو پھر اس سارے قضیے میں میری کیا حیثیت ہے؟ صرف ایک مجرم کی، اگر انکار کرے تو قصوروار ہو!"

"آسیہ۔۔۔ نہیں آسیہ۔۔۔۔۔۔۔۔ خدارا ایسا نہ کہو، کیا تمھیں لگتا ہے کہ میں تمہارے متعلق ایسا کچھ سوچ سکتا ہوں؟"

"پھر تم مجھ سے کس جواب کے منتظر ہو کہ ہر سوال خود ہی جواب ہے۔"

میرے اور آسیہ۔۔۔۔۔ کے درمیان دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ وہ اک معصوم، نازک، سانولی، الھڑ سی دلھن وصل کے بعد شتابی، فراق کے کرب میں تپنے لگی۔

☆☆☆

"خوش نصیب ـــــ کیسی خوش نصیب؟ کون خوش نصیب؟ وہ ــــــــ وہ خوش نصیب ہے؟ اس میں تو ہجرِ مسلسل ان کے مقدر میں لکھا ہوا ہے۔ میں ان کو کوئی بھی خوشی نہ دے سکا۔ صرف دکھ، درد، جدائی اور فرقت دی۔ ان کی آنکھوں نے جو خواب دیکھے تھے ان کی تعبیریں دیکھنے سے پہلے ہی اس کی بینائی چھین کر لے گیا۔ دل میں جو ارمان سجائے تھے وہ جلا کے راکھ کر دیے۔ جو آرزویں سمیٹیں تھیں ان کا بے دردانہ قتل کیا۔ کیا پھر بھی وہ خوش نصیب ہے ــــــــ؟"

"ہاں ہے! کیوں نہیں ہے؟ کہ اسے تم جیسا پاکیزہ جذبات رکھنے والا ہم راز مل گیا ہے۔ ان کے تئیں تمہاری محبت تیرے دل میں ٹھاٹیں مار رہی ہیں۔ ان کی جدائی و فرقت کا غم تم بھول نہیں پاتے۔ تم نے ان کو اپنی یادوں کی سرزمین میں پیوست کر رکھا ہے۔ جس سے تمہارے دل میں محبت کے خوش پذیر پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ان کی موجودگی کا احساس تمہارے انگ انگ روم روم بات بات جذبہ جذبہ سے جھلکتا ہے۔ دیکھنے والے تمہاری آنکھوں کی پتلیوں میں ان کی تصویر دیکھ ہی لیتے ہیں۔ راہ وفا کی یہ کون سی سالک ہے؟ جو لیلیٰ، شیریں، سوہنی و ہیر کی بھی شہزادی بننے جا رہی ہے۔ کیا وہ بھی وفا کی اسی دھار پر چل رہی ہے؟"

"مجھے اپنی وفا پر اتنا بھروسا نہیں ہے جتنا کہ ان کی وفا پر!!!"

"ہائے اللہ! خوش نصیب وفا کی پاکیزہ پیکر ــــ؟"

"ابو عبیدہ، میرے زخم کھرچ کر ان پہ نمک پاشی نہ کرو!"

"توبہ خدایا! یہ کیسی وارفتگی ہے"

"ابو عبیدہ میں کیسے اپنے دل کی دھڑکنوں کو تھام لوں؟ کیسے ان کے خیال کو ٹال لوں؟"

—— آ —— آس —— آسی —— آسیہ ---------

میری زبان سے بار بار آسیہ —— کے نام کی تکرار رونے کی ہچکیوں کے ساتھ ہوتی رہی۔ ہشام کے سامنے میری محبت کی شدّت کا راز افشا ہوا۔ مجھے انہیں اس طرح تکلیف نہیں دینی چاہیے تھی کہ وہ بھی میری ہی طرح جدائی کے صدمے کو برداشت کر رہے تھے۔ صرف آسیہ —— اور میں منکوحہ نہیں تھے۔ صرف ہم دونوں میاں بیوی ہی ایک دوسرے سے محبت تو نہ کرتے تھے۔ محض ہم دونوں ہی فرقت کے صدمے سے دوچار تو نہ تھے۔ صرف ہم ہی قربانی تو نہ دے رہے تھے۔ جو میں یوں اس درد جدائی سے بے قابو ہوئے جارہا تھا۔ ہاں یہ تھا کہ اب ایک زمانہ اس کو دیکھے بغیر ہی گزر گیا تھا۔ کوئی بات، پتہ نہ خبر۔ وہ کیا کرتی ہوگی؟ وہ سب غمِ فرقت کی بھٹی میں جلتے ہوں گے۔

"ہاد فرہاد صاحب اپنا کان ادھر لاؤ-----!

یہ سن کے میں خوشیوں کے گہرے سمندر میں غوطہ زن ہوگیا۔ بیچ صحرا میں جیسے مجھے راہ مل گئی۔ بیچ بھنور میں ہاتھ سے چھوٹا ہوا پتوار مل گیا۔

جمعہ کو میں ابو عبیدہ کے ہمراہ ڈرا ڈرا، سہما سہما اپنی بستی کے نزدیک پہنچا۔ یادوں کے کئی جہاں وا ہوگئے۔ میرا ماضی، میرا بچپنا میری آنکھوں کے سامنے پھر سے اپنے پر لہرانے لگا۔ ٹھہرے ٹھہرے قدموں، نازک نازک آہٹ سے میں اپنے گھر کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا۔ راہ سے گزرتے ہوئے مجھے صبا 'لیلیٰ' ضیاء عرفان اور باقی لوگ اپنے کام اور

چھوٹے چھوٹے بچے کھیلوں میں مصروف ملے۔ میرا دل چاہا کہ ان سے لپٹ لپٹ کر روؤں۔ اپنی جدائی و فرقت کا بدلہ لوں مگر جذبات کے بے قابو ہونے کا ایک ہی لمحہ ۔۔۔۔اس لئے میں آنسوؤں اور آہوں کو ضبط کرتے ہوئے اپنے گھر کی طرف گامزن رہا۔ میں ایک ایک قدم گھر سے قریب ہوتا جاتا تھا مگر میری روح مجھ سے دور ہوتی جاتی تھی۔ آنکھوں میں جیسے آنسوؤں کے سمندر ابھر آئے، دل میں نالوں کے آتش فشاں ابلنے کے لئے بے تاب تھے۔ میں سمجھ نہیں پارہا تھا کہ گھر کے آنگن میں داخل ہوکر میں اپنے جذبات پر کیسے قابو پاسکوں گا؟ میرے قدم لڑکھڑانے لگے، سر چکرانے لگا۔ مجھے توہمات نے گھیر لیا.................. آج بھی اس گھڑی کا خیال آتا ہے تو دل مارے خوف کے کانپ جاتا ہے اور پسینے سے شرابور ہوجاتا ہوں۔۔۔۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے گھر کے آنگن کا دروازہ کھولا تو سامنے ۔۔۔۔اماں ۔۔۔۔۔۔میری اماں۔۔۔۔۔میری پیاری اماں۔۔۔۔۔۔۔سیڑھیوں پر اسی طرح انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی جیسے کہ یونیورسٹی سے میرے لوٹ آنے کے بعد میرے انتظار میں بیٹھا کرتی تھی۔ جی چاہا کہ اپنا گریبان چاک کروں ۔۔۔۔ دل کو چیروں ۔۔۔۔پھوٹ پھوٹ کے روؤں ۔۔۔۔۔۔میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ میری ماں بے اختیارانہ جذب کے عالم میں سیڑھیوں سے اتر کر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگی۔ ممتا کی حس نے انہیں آگاہ کردیا تھا۔ وہ مجھ سے بے ساختہ لپٹ گئی اور بے درد چیخیں ان کے حلق سے نکلنے لگیں۔ "میرے لال، مرے جگر، ۔۔۔۔۔۔۔میرے ہاڈو، میرے ہاڈو ہاڈو۔۔۔۔۔۔!!!!!!

میں سمجھ نہیں پارہا تھا کہ میری مشکلیں بڑھ گئی یا آسان ہو گئیں! میرے گرد میرے گھر والوں کا حلقہ بنا ہوا تھا اور میں نہ جانے کمرے میں کیونکر پہنچ گیا تھا۔ وہاں ہر دل آہوں سے پر، ہر آنکھ اشکوں سے زیب بار تھی۔ گویا زبانیں گنگ تھی اور ہر بات حلق سے نکلنے والی رونے کی آواز اور آنکھوں سے بہنے والے اشکوں سے کی جاتی تھی۔ ہم یہ سمجھنے سے بھی قاصر تھے کہ ہم اپنے ملن پر رو رہے تھے کہ ہونے والی جدائی پر۔ صحیح بات یہ ہے کہ دونوں باتیں یہاں موجود تھیں۔ یہ وصل تھا جدائی نہ تھی، جدائی تھی وصل نہ تھا۔ اس میں تو کھٹکا ساتھ لگا ہوا تھا۔ امی میرے چہرہ کو، میرے ہاتھوں کو، میری پیشانی کو ایک ایک کر کے وقفے وقفے سے چومتی پھر مجھے گلے لگا کر رونے لگتی۔ ان کا یہ عمل کافی دیر تک مسلسل جاری رہا۔ ابو مجھ سے لپٹنے کے لئے بے تاب تھے مگر وہ امی کی بے تابی میں مخل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ وہ ان کی ہر بات کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ان کے جذبات کی بہت زیادہ قدر کرتے تھے۔ وہ ایک مثالی شوہر تھے اور اماں بھی ایک فرمانبردار سعادت مند خاتون تھی۔ یہ درد و غم، فراق و آنسو بھی عجیب ہیں ناخن، بالوں کی طرح نیا نیا جنم لیتے ہیں جتنا کاٹو جتنا کم کرو اتنا ہی اور زیادہ اگتے ہیں۔ ہمارے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا مگر .... کچھ بھی نہ تھا۔ ہم سب اپنے نالوں اور آہوں کو آسمان تک پہنچانا چاہتے تھے مگر مجبوری تھی کہ باہر بھی آواز نہ جائے کہ ستارے گردش میں تھے۔ آہیں اگر بے اختیار ہو گئیں تو ابھی ماتم میں بدل جائیں گی۔ اس لئے اپنے منہ میں کپڑا دے کر رونے لگے۔ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ مجبوری کس کو کہتے ہیں اختیار و بے اختیاری کیا ہوتی ہے!

شام گئے تک امی نے بڑے شوق سے کھانا پکایا۔ ان کے شفیق چہرے سے ایسا لگتا تھا کہ اب اگر وہ مر بھی گئی تو سکون کی موت مرے گی۔ آج مدتوں بعد ایک ساتھ مل بیٹھ کر ہمیں کھانا کھانے کا موقع مل گیا۔ کھانا لذیذ پکا تھا کہ نہیں اس کا ہمیں احساس نہ تھا۔ وہاں تو مل بیٹھ کر کھانے نے ہی ایسی لذت بخشی کہ دنیا کے تمام ذائقے اس کے سامنے پھیکے لگے۔

کھڑکی سے باہر آنگن کی طرف میری نظر چلی گئی تو باہر میرے کھیت میرا انتظار کر رہے تھے۔ تتلیاں میری راہ تک رہیں تھیں۔ جوہڑ میرے آنے پر اچھل اچھل رہے تھے۔ آبشار ساز بجا رہے تھے۔ ہری گھاس کسی چنچل شوخ حسینا کی طرح لہرا کر ناچ رہی تھی۔ پھول مہک رہے تھے۔ چنار، بید، ناشپاتی، انگور اور سیب کے درخت کُن انکھیوں سے مجھے تک رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے گلے ملنے کے لئے بے تاب ہیں۔ چنار نے بارہا اپنی باہیں پھیلا کر اپنی گودی میں بٹھا کر مجھے جھولا جھلایا تھا۔ وہ رو رو کر مجھے سے گلہ کر رہا تھا کہ "میں اب تلک کہاں رہا؟ اس سے دور کیوں رہا؟ میں کس کو جھولا جھلاتا، کس کو گودی میں بٹھا کر فضاؤں کی سیر کراتا؟" میرے پاس اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ یہی گلہ مجھ سے وہ باقی درخت بھی کر رہے تھے۔ بید کا درخت مجھ سے کہہ رہا تھا" آؤ مجھ سے گلے لپٹ کر روؤ۔ میں وہی بید کا درخت ہوں جس کو تم نے اپنے ہاتھوں سے اس آنگن میں لگایا ہے۔ جس کی تراش خراش کا تم بہت خیال رکھتے تھے۔ جس پر تمہاری آسیہ نے تمہارا نام "میرے عبدالہادی "کندہ کیا

ہوا ہے۔ میرا سایہ تمہاری فرقتوں کا رازدار ہے۔ آؤ آؤ میں وہ سب راز تمہیں بتاؤں۔
جو درد آسیہ نے مجھ سے بانٹا وہ امانت تمہیں سونپوں۔"
پرندے مجبوری کے گیت گا رہے تھے۔ مینا مجھ سے کہہ رہی تھی "اے توتا مجھے چھوڑ
کر تو کہاں چلا گیا ——————؟" بلبل نے فریاد کی "اے گل تو کہاں مرجھا گیا
——————؟" پروانہ رونے لگا کیا اے شمع تو کہاں بجھ گئی
——————؟" چاند مجھے بڑی بڑی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ چمکتے ہوئے تاروں
نے شور اٹھایا کہ "اس آنگن کی کہکشاں میں یہ تارہ پھر سے کب آیا؟" وہ سب مجھے دیکھ
دیکھ کر مسکرا رہے اور ایک دوسرے کے ساتھ لکا چھپی کھیل کر اپنی خوشی کا اظہار کر
رہے تھے۔ سبک سبک ٹھنڈی ہواؤں نے میرا گھیراؤ کیا۔ وہ اپنی نرم نرم پپوٹوں کو
میری پپوٹوں سے ملاتی اور مجھ سے اغل بغل ہو رہی تھیں۔ نہ جانے ہم سب ایک
دوسرے سے یوں قربت و محبت کا اظہار کس بنا پر کر رہے تھے؟ کہ ابھی پل بھر میں
پھر سے جدائی مقدر تھی۔ میں ان میں سے کسی سے بھی جدا نہیں ہونا چاہتا تھا مگر ایسا
ممکن نہ تھا! یہاں جدائی ہی مقدر تھی جدائی ہی اصل حقیقت۔

پھر ایک خیال دوڑ کے میرے پاس آیا اور چپ کے سے کان میں آکر کہا:
"کن سوچوں میں گم بیٹھے ہو؟ جلدی جاؤ اندر کوئی تنِ نازک تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ ان
کو اور کتنا ترساؤ گے؟ ان کی فرقتوں کا تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ نہیں؟ ان کے صبر
کا کتنا امتحان لو گے؟"

میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو آسیہ ـــــــ وہاں خاموش پیکر بن کر اداس بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کے سامنے رخصتی کی پہلی رات کی حالت عود کر کے آئی تھی؛ مگر یہاں کئی بے تابیاں اور بہت سا اضطراب پھوٹ بہنے کے لئے تیار تھا۔اس لئے صبر کا پیمانہ اب زیادہ دیر لبریز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔اس سے اب مزید انتظار نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا پتہ یہ گھڑیاں جو نصیب سے ملی تھیں کب ختم ہوں ؟ اک خبر آئے تو شتابی جانا پڑے۔بے تاب ہو کر آسیہ ـــــ نے نالوں سے پُر میرے نام کی آواز چیخوں کی سرگم میں نکالی۔

"عبدالہادی ـــــــــ جو فضاؤں میں دیر تک گونجتی رہی۔

"عبدالہادی۔۔۔۔۔۔ عبد الہادی۔۔۔۔۔۔ عبد

الہادی۔۔۔۔۔۔۔عبد الہادی " ہاد ۔۔۔دی

دی دی دی !!!!!ہاد ۔۔۔۔دی دی دی دی ۔۔۔ی ی ی چیخوں سے گویا درد اور ان قندیلی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹِپ ٹپ ٹِپ خون بن کر رِس رہے تھے۔ "عبدالہادی" نام کے لفظوں میں گویا زہریلے نشتر ہوں جو میرے دل میں چبھ رہے تھے۔ جس سے میرے دل کی دیواروں پر "آس ، آس، آس، آسیہ ـــــــــ

"آسیہ "ـــــــــ"آسیہ "ـــــــــ کندہ ہو رہا ہو۔

"ہاد، میرے فرہاد" ۔۔۔۔۔۔۔"تم نے میرے صبر کا کتنا امتحان لیا؟

"ابھی تو کچھ لیا نہیں ہے!"

"یہ کتنا انتظار کرایا؟"

"ابھی تو شروعات ہے۔"

"تم کو میری یاد بھی نہ آتی تھی؟"

"یہ کہو کہ کسی لمحے تمھیں بھولا بھی ہوں!"

"اتنے دنوں میں کیوں نہ آئے؟"

"کیسے آتا کہ ہر طرف نظروں کے پہرے لگے ہوئے ہیں؟"

"وہ تو آج بھی ہیں پھر کیسے آئے؟"

"بے تابیاں اب مزید نہیں الجھ سکتی تھیں۔ تمہاری بے قرارایاں فلک سے اثر لے کر آگئیں، وہی مجھے یہاں کھینچ لائی ہیں!"

"آسیہ ——— وقت ریت کے ذروں کی مانند میرے ہاتھوں سے کیوں پھسلتا جارہا ہے۔ میں اس کو روک بھی نہیں پاتا۔"

"ہِک ہ ہاہاد ——— تمھیں مجھ سے جدائی کی جلدی کیوں ہوتی ہے؟ کیا تیری زندگی میں میرے لئے کچھ کم قلیل وقفے بھی نہیں ہیں؟ میں جن میں اپنی قسمت پر ناز کرکے تمھیں پالیتی؟"

"یہی سوال— پھر وہی سوال-- ہائے انہی سوالوں نے مجھے مجنوں کا ہمسفیر بنادیا ہے۔ آسیہ ——— تم کو لیلیٰ بنادیا ہے! یہ سوال ہمارا تعاقب کب چھوڑیں گے؟ آسیہ ——— میری جان -- دنیا میں صرف محبت ہی نہیں ہے۔ ہائے کاش--- کاش -- دنیا میں صرف محبت ہی ہوتی -- نفرت نہ ہوتی -- نفرت کی دیواریں نہ ہوتیں -- بے انصافی نہ ہوتی، زیادتیاں نہ ہوتیں، مقابلہ آرائیاں نہ ہوتیں -- زور آزمائیاں نہ ہوتیں --

موت نہ ہوتی۔۔اس کے نتائج بیوگی، بے سہارگی، فرقت، غربت، یتیمی، ناانصافی۔۔۔ نہ ہوتی۔اور بہت کچھ۔۔نہ ہوتا۔ آسیہ —— میرے دل کی دھڑکن ---یہ سوال۔ --یہ سوال بہت مشکل ہیں۔۔بہت مشکل۔۔ ان کا جواب --- بہت دشوار ہے! آسیہ —— میری روح کی تازگی-- کاش ---ہمارے سامنے صرف محبت کا سوال ہوتا تو شاید ہم اس کا کچھ جواب تلاش لیتے ؛ مگر اس سے زائد اور پیچیدہ سوال ہر روز ہمارے سامنے کھڑے ہو رہے ہیں۔"

میں اِس رات کا ہجرت والی غمگین رات بننے سے خائف تھا۔اُس رات کی رقت آمیز سسکیوں کی سُوئیاں اب تک مجھے چبھ رہیں تھیں۔اس لئے میں نے کوشش کی کہ آسیہ —مجھ سے دردِ فرقت کی داستان نہ کہے میں اس کو ہجر کی سختیوں کے بارے میں کچھ نہ کہوں کہ اس سے اس کے غم میں اور اضافا ہو گا۔میں نے ان باتوں کی طرف سے آسیہ —کا دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔

"آس—اسکول اور مکتب کا کیا حال ہے کتنے بچوں نے حفظِ قران کیا؟"

آسیہ ——میرے اس سوال پر چونکی! وہ میری مراد کو سمجھ گئی تھی کہ میں نے غم کی کیفیت کو متغئیر کرنے کے لئے ایسا سوال کیا ہے۔

"ہ ہاہاد—— با—بات —بات ت کیوں ٹال رہے ہو؟"

"آس— درد فرقت کے قصے نہ چھیڑو۔اب ان کو چھیڑنے سے فائدہ؟"

"یہ ہِک ہیہ ہِک آں آنسوؤں ں کی—کی پھوہار میں اِضافا تو کر رہے ہیں۔اس سے بڑا اور— اور کیا فائدہ ہونا چاہیے؟"

"میری ہمدم میں تمھیں مزید غم دینا نہیں چاہتا۔ (میری چیخیں بے تاب ہو گئیں اور میں بے ساختہ رونے لگا۔) م می میں ں تمھیں پہلے ہی بہت غ غم — غم دے چکا ہوں۔ ٹ تم تم نے کتنے صدموں کی تاب لائی، اپنے ابو کی رحلت، میری جدائی، میرے ابو، امی کے درد و غم میں شرکت۔ ٹ، تم ہمت و عزیمت کا پیکر ہو۔ آسیہ۔ اب نہ چھیڑو، کچھ نہ چھیڑو، جاؤ، بھول جاؤ، ماضی کو، اپنے بچپنے کو، تتلیوں کو، کھیتوں کو، کھلیانوں کو، اسکول کو، رمضانی راتوں کو، عید کو، عید کے گیتوں کو، یموؤ وؤلو کو، اتی پتی کو، میرے برفیلے مجسموں کو، برفیلی جنگ کو، دلیل کو! سیرت کو، صبا کو، لیلیٰ کو، صہیب کو، عرفان کو، مدثر کو، حسیب کو، شبیر کو۔۔۔۔ آسیہ — بھول جاؤ، بھول جاؤ، وہ دنیا اب نہیں رہی، وہ دنیا اب ہم سے دور --- چلی گئی، بچپنا ہم سے دور --- چلا گیا۔ آسیہ — اب نہ چھیڑو، نہ چھیڑو، کچھ نہ چھیڑو آسیہ — آسیہ — آسیہ —!!!!

"ہادو — کیسے بھول جاؤں ؟؟؟ دل میں بسی محبت کو کیسے مٹاؤں ؟؟؟؟"

"آسیہ — بھول جاؤ، بھول جاؤ، بھول جاؤ! جو دنیا نفرت کی پروردہ ہو اس دنیا میں محبت کو بھول جاؤ — بھول جاؤ۔"

آنسوؤں کا سیلاب آنکھوں سے امنڈ رہا تھا۔

"اچ اچھ اچھا!!!، ہاد — اب چپ ہو، چپ ہو، نہ روؤ، بھول جاتی ہوں، نہ چھیڑوں گی نہ چھیڑوں گی، بھول جاتی ہوں، بھول جاتی ہوں، بھول۔۔۔!"

"ہاد — ادیبہ، ہبان، مہوش اور کامران نے الحمدللہ حفظ پورا کیا۔ آنیہ، طیبہ، ساجد، ضمیر نے بھی بیس بیس پارے کیے ہیں۔ دانش، یاسر، فریحہ، طالب اور برہان ناظرہ پڑھ

رہے ہیں۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں میں بھی عبور حاصل کر رہے ہیں اور باقی مضامین میں بھی اچھی خاصی قابلیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔"

"اور تمہاری کتاب کہاں تک پہنچی؟"

"منشائے قران"؟

"ہاں۔"

"ووووہ وہ اب تکمیل کے قریب ہے۔ آ آپ پ دعا کریں کہ جلد شائع ہو جائے۔"

"انشااللہ جلد شائع ہو گی۔ اللہ تمھیں اس کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ یہ ایک اہم موضوع تھا اللہ کا شکر ہے کہ تم نے اس کی طرف توجہ کی۔ کیا میں اس میں سے کچھ سن سکتا ہوں۔"

میری یہ بھی غرض تھی کہ دیکھوں منشائے قران کو وہ کس حد تک سمجھتی ہے۔ آسیہ کی یہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ وہ بات کی نزاکت اور حال کے تقاضے کو بہت جلد سمجھ جاتی تھی۔ انھوں نے بڑی معصومیت کے ساتھ عالمانہ انداز میں کہا:

""سورہ فتح" میں صلح حدیبہ پر صبر کی مصلحت پر فتحِ مبین کی بشارت سنائی گئی ہے۔ جو مسلمانوں کے حق میں سراسر خیر تھی مگر اُس وقت وہ اُن پر بہت شاق گزری اور گزرنی بھی چاہیے تھی! لیکن اللہ کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھنے کے لئے فہم و ذکا کے علاوہ وقت بھی درکار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو بھی کرتے ہیں اس میں ہماری بھلائی ہوتی ہے۔ کبھی ہم اس کو سمجھ پاتے ہیں اور کبھی نہیں سمجھ پاتے۔ اس لئے ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے حالات پر صبر کرنا چاہیے اور اس کے فیصلوں پر راضی رہنا چاہیے۔"

" ہادو۔۔۔ سورہ یوسف کو اپنا وِرد بناؤ کہ یہ سورہ ایک نوجوان کے لئے بہترین راہنما ہے کہ کیسے سخت ترین حالات میں بھی ناجائز افعال سے بچ کر اپنے ایمان کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔ یومِ قیامت اللہ تعالیٰ ایسے پاکباز نوجوانوں کا حشر یوسفؑ کے ساتھ فرمائیں گے۔"

"آپ کا تدبّر قران رشک افزا ہے۔ بڑے پیارے اور احسن انداز سے مجھے سمجھایا۔ اللہ میاں تیرا شکر کہ مجھے اتنی اچھی اور پیاری استانی عطا کی۔ مزید سنائیے جنابِ عالی!"

میں نے شوخی کے انداز میں آسیہ۔۔۔ سے باتیں کی۔ کیونکہ میں نے ان کو بہت رلایا تھا اب میں ان کو تھوڑا ہنسانا چاہتا تھا۔ حیا کی وجہ سے آسیہ۔۔۔ کے عارض پر کئی سندر چاند کھل گئے اور آنکھیں گل آفتاب بن کر جھک گئیں۔ ہلکے تبسم نے اُس کے چہرے کی رنگینیوں میں مزید اضافا کیا۔ وہ دل ہی دل میں میرے لئے دعائیں کرتی اور میری شوخی پر نثار ہو رہی تھی۔

"میں نے اس کتاب میں اصولِ ازدواج اور تربیتِ اولاد پر بہت زور دیا ہے۔ میرے نزدیک بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ بڑوں کی تربیت بچوں کو مثالی بناتی ہے۔ اچھائی اور برائی کا دارومدار گرچہ کئی افعال پر منحصر ہے پر اس میں بہت بڑا دخل، تربیت اور عملی زندگی کا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان اگر آپس میں کبھی ناراضگی یا تلخی ہو جائے تو اس کا اظہار بچوں کے سامنے نہ کیا جائے۔ کبھی بھی ایک دوسرے کی برائی بیان کریں نہ شان میں کچھ گستاخی کریں۔ کیونکہ ہر عمل کے اثرات اذہان پر مرتب ہوتے ہیں۔ ایک

دوسرے کے ساتھ نہایت مہذبانہ، شریفانہ، شائستگانہ انداز میں پیش آئیں۔ آپس میں ادب سے باتیں کریں جس میں محبت کی مٹھاس اور چاشنی ملی ہوئی ہو۔ ایک دوسرے کے حقوق کا بہت خیال رکھیں، ایک دوسرے کو خوش رکھنے، ہنسانے کی کوشش کریں۔ جس میں بچوں کو بھی شامل کریں۔ زندگی کو سلیقے اور طریقے میں ڈھالیں۔ گھر کو تعلیم گاہ بنادیں۔ اہل اللہ کی مجالس میں حاضری دیں۔ اس کی بدولت گھروں میں دوستانہ اور دیندارانہ ماحول بن جائے گا۔ اگر میاں بیوی ان اصول وضوابط کالحاظ رکھتے ہوئے ازدواجی زندگی گزاریں گے تو دنیا حسین بن جائے گی۔ زندگی پرسکون اور اطمینان سے گزرے گی۔"

"ماشااللہ کتنے بہترین اصول ہے۔ اللہ عمل کی توفیق نصیب کرے"۔

آسیہ ــــ کے منشا کا امتحان کرتے ہوئے وہ مجھے بھی قران کا منشا سمجھا گئی تھی۔ آسیہ ــــ کے اس منشا سے نہ صرف میرے سوال کا جواب مل گیا بلکہ وہ مجھے درس دے کے اہم سبق سمجھارہی تھی۔ میں یہ بیان کرنے سے قاصر ہوں کہ آسیہ ــــ کے حسن انتخاب، حسن تشریح، حسن تفہیم کی وجہ سے میں اطمینان وخوشی کے کس عالم میں سرشار تھا؟ میں اپنے آپ کو کتنا سعادت مند سمجھتا تھا۔ آسیہ ــــ بھی میرے منشا کا امتحان لینا چاہتی تھی۔ الحمدللہ میں ان کے منشا کو سمجھ گیا تھا۔ وہ میرے خلوص اور پاکیزگی سے عہد لینا چاہتی تھی؛ جس کی بہترین مثال حضرت یوسفؑ نے قائم کی تھی۔ اس لئے میں نے بھی آسیہ ــــ سے گزارش کی:

"آسیہ ــــــ اللہ کی مدد اگر نہ شامل ہو ہم خود سے کچھ نہیں کر سکتے۔ تم میرے لئے دعا کرو کہ اللہ مجھے حضرت یوسفؑ جیسے عزائم عطا فرمائے۔"

"میں بھی قرآن کریم کا یہ سورہ خصوصی طور پر اسی لئے آپ کو بطورِ ورد بلکہ یہ جانو تحفتاً دے رہی ہوں۔ مجھے تم سے یہی امید ہے۔ اللہ تمہاری حفاظت اور مدد فرمائے۔"

"آمین آمین"

"ہِہ ہہ ہاہاد ــــــــ تم نے کہا تھا کہ اس سال ہم بیت اللہ جائیں گے۔ کعبے سے لپٹ کر اُسے اپنی بے بسی دکھائیں گے دل کے مزار میں دفن کئے ہوئے، اپنی مجبوریوں کے تمام قصے سنائیں گے۔ غلاف کعبہ پکڑ کر ہم نئے زمانے کے عہد کریں گے، حسین سرزمیں پر نئے خواب ـ پاکیزہ خواب دیکھنے کا عہد۔ مَطاف میں دیوانے بن جائیں گے۔ سب سے بے خبر ـ ہر ایک سے بے نیاز ـ ـ بس اسی نوازنے والے کے نیاز گزار ـ ـ ـ نیاز مند ـ ـ حجرِ اسود کے بوسوں سے اپنی روح کو تازگی بخشیں گے۔ صفا مروا میں بے قرار ــ بے اختیار پھریں گے۔ منیٰ میں مسکنت اختیار کریں گے۔ مکے کی ان تمام تھکاوٹوں ـ ـ ـ سب بے قراریوں کو سکون کے لمحے نصیب کرنے کے لئے پھر مدینہ ـ ـ ـ ہائے مدینہ ـ ـ ـ مدینہ ـ ـ ـ سر کے بل چلیں گے۔ اپنی پلکوں کو اُن مبارک راہوں پر بچھائیں گے۔ مواجہ ـ ـ سامنے ہوتا! ہاد ـ ہاد ـ ـ

آس ــــ آس ــــ نہ روؤ ــ ہاں کہو!

اس کی زیارت سے آنکھوں کو ٹھنڈک، دل کو قرار پہنچائیں گے۔ ریاض الجنۃ، مزارِ بقیع، مسجدِ قبا، میدانِ بدر، میدانِ اُحد---ہائے کیا کیا ارمان تھے دل میں ان زیارتوں کے۔کب---کب!

چُپ-چُپ--آس ــــ میری آس---چُپ! اب ان صاحبان سے ہی براہِ راست ملیں گے۔

آسیہ ـــ کے دردآبلہ دل پر آخری وار کرتے ہوئے میں نے رک کے رک کے الفاظ سے کہا:

"آسیہ ـــــ دردِ فرقت کی کتاب پھر کھولی جائے!"

آسیہ ـــ کے چہرے پر افسردگی کی ایک طویل لہر چھاگئی۔ تمام صورت حال میں ہمارے لئے ایک ہی نتیجہ نکلنا تھا۔۔۔ محبت۔۔۔میں جدائی۔۔۔

"ہاہاہا: (اس آواز میں پیار کی مٹھاس کے ساتھ ساتھ حزن کی لے بھی صاف جھلکتی تھی۔) ٹھیک ہے پر مجھے اس بات کی اجازت دے سکتے ہو؟"

"کس بات کی؟"

"تمہارے انتظار کی! میں اب تم سے وابستہ ہو چکی ہوں!"

یہ سن کر میرے دل پر چھریاں چلنے لگیں۔ کیونکہ یہ الفاظ آسیہ ـــ نے اس اثر میں ڈوبے ہوئے کہے کہ اب گویا کبھی میں واپس۔۔۔! میں نے آسیہ ـــ کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

"انشااللہ ہم بہت جلد بہم ہوں گے۔ دیکھو روؤ نہیں! میرے دل کا بھی تو یہی حال ہے۔ اگر تم روؤ گی تو پھر میں کیا کروں گا؟"

آسیہ ــــ نے ہنسنے کی کوشش کی۔ مگر زخمی مسکراہٹ پر ہی اکتفا کیا۔

میرے دل کی بھی وہی حالت تھی جو آسیہ ــــ کی تھی۔ ابھی ابھی تو ملے تھے، اور ابھی ابھی جدائی مقدر ہوئی۔ نکاح ملن ہوتا ہے، نہ کہ جدائی! اس جدائی کو ابتدائی مراحل میں گزارنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ ایک عورت کا مقدر ہی صبر سے لبریز ہے۔ سوچیے تو اک جان نازک مگر ان سخت مراحل کو کیسے بخوبی برداشت کرتی ہے۔ پھر وہ تو ایک دین دار خاتون تھی جس نے ابتدا ہی سے فرمانبرداری سیکھی تھی۔ عورت اگرچہ نازک جان ہے، مرد بھی تو سخت جان ہے؛ دونوں ایک مغرورانہ احساس سے دوچار ہوتے ہیں۔ عورت کی آنکھ باہر چھلکتی ہے، مرد کی آنکھ اندر بہتی ہے۔ فرق کچھ نہیں ہے۔ دونوں ہی دل رکھتے ہیں، سنگ وخشت کوئی نہیں۔

"ہاد ــــ وہ دیکھو اس کھڑکی سے ہمارا یہ گانوؤں کتنا خوب صورت نظر آرہا ہے؟"

"آپ کی آنکھوں سے دیکھوں یا اپنی آنکھوں سے؟"

"میری آنکھوں سے دیکھو!"

میں نے بچوں کی طرح اپنی آنکھیں بند کر کے آہستہ آہستہ کھولیں۔

"اب بتاؤ، کہاں دیکھنا ہے؟"

"اس پر کیف چاندنی سماں میں سارے گانوؤں پر ایک نظر دوڑاؤ، کیسا خوب صورت ہے ــــــــ ہے نا!!!!!!!ان سب راستوں کو غور سے دیکھ لو جن میں بچپن میں تم،

ں، صہیب، صبا، خالد، لیلیٰ، سیرت، مدثر، حسیب، شبیر، عرفان کھیلا کرتے تھے۔ ان
رختوں کو دیکھو جن کی شاخوں پر ہم جھولا ڈالتے تھے، ان کھیت کھلیانوں کو دیکھو جن
ں ہم ایک دوسرے کے ساتھ لکاچھپی کھیلتے اور تتلی پکڑتے تھے۔ آج سب کچھ غور
سے جی بھر کے دیکھ لو کیا پتہ کہ پھر زندگی یہ دن دکھائے کہ نہیں!"

"ہر زاویہ میرے سامنے ایک نیا رنگ وروپ دھار کر ظاہر ہو رہا ہے۔ جو کل تک بھی
میری نظروں کے سامنے حسین تھا؛ پر آج مجھے اس گاؤں کی، ان گلیوں کی، ان کھیتوں
کی، ان درختوں کی، ان تتلیوں کی دوشیزگی دوچند معلوم ہوتی ہے۔ کہ میں انہیں
تمہاری آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں!"

آسیہ ——— نے اپنی بادام جیسی شرمیلی نگاہیں جھکائیں تو شبنم میں دُھلے آنسوؤں کے
قطرے میرے ہاتھوں پہ وفاؤں کا تاج محل بنا گئے۔

"آسیہ ——— اب میری بے تابیوں کا اور امتحان نہ لو۔"

"پر تم میرے صبر کا امتحان لے لینا!"

میں نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟ --- ناداں!"

"ہاد ——— میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

وہ مزید کچھ کہنے والی تھی کہ میں نے اس کی بات اچک لی۔

آس ——— تم میری آس ہو، میری امید ہو۔"

"ہاد"

"جی"

"تمھیں یاد ہے یہ انگوٹھی جو تم نے مجھے پہنائی تھی۔ میرے پاس تمھاری ایک اہم نشانی ہے۔ دیکھو اس میں میرے لئے دنیا کے حسین الفاظ لکھے گئے ہیں۔۔۔۔۔

"عبدالہادی"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"ہاں میرے ہاتھ کی انگلیوں پر بھی تمہارا نام کندہ ہے۔۔۔ آسیہ............"

میں نے پر درد لہجہ میں یہ نام پڑھا۔ اس انداز سے گویا میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر الفاظ میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

"ہاد۔۔۔۔ وہ دیکھو شمال مغرب کی طرف!"

"وہاں کیا ہے؟"

"میرے دل کی دھڑکنیں!"

"کیا مطلب؟"

"میرے انتظار کی آنکھیں!"

"میں نہیں سمجھا!"

"ہاد۔۔۔۔ وہ راستہ تمہارا۔۔ راستہ ہے۔۔۔ سفر کا۔۔ راستہ ہے۔۔ میں یہ راستہ تمہارے واپس آنے تک مسلسل۔۔۔۔ مسلسل۔۔۔۔ تکتی رہوں گی!!! اسی راہ سے تمہاری آمد کا سورج طلوع ہو گا! وہ دن کتنا اچھا ہو گا۔ ہو گا نا۔ جیسا کہ آج کا دن، بہت بھاری بڑا مشکل ہے۔"

آسیہ ــــ نے زندگی میں ایک اصول سیکھا تھا۔ وہ اصول خلوص کا تھا۔ اس خلوص کی وجہ سے وہ اپنے سامنے پہاڑوں جیسے سخت دل کو بھی موم کرنے کا ہنر جانتی تھی۔ میرا تو ایک نازک سا دل تھا، جو جذبات سے مغلوب ہو کر کیک مادے کی طرح بہت جلد بہہ جاتا تھا۔ پھر اس نے آسیہ ــــ کو قریب بہت قریب سے دیکھا تھا، جانا تھا، محسوس کیا تھا اور اس کے خلوص کا مظاہرہ کیا تھا۔

ہم دونوں اس وقت ابر آلود آسمان بنے ہوئے تھے جس نے نہ جانے کب سے ابر کے ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جمع کیا تھا۔ بے حسی کی وجہ سے اس کو بوجھ کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ جب اس کے حواس ٹھکانے آئے تو بوجھ کی وجہ سے سارے جسم میں درد ہونے لگا۔ اس لئے اب وہ جلدی جلدی ابر کے اس بوجھ کو اتارنے کی فکر میں تھا جس کی صورت برسات ہوتی ہے۔ انسان کے پاس بھی ابرِ غم کے بوجھ سے ہلکا ہونے کے لئے یہی پانی ہوتا ہے جو آنکھوں سے برستا ہے! اس وقت ہم دونوں اس کو خوب برسا رہے تھے۔

اس رات آسیہ ــــ اور میں اتنا زیادہ روئے۔ مجھے لگا شاید اب مزید رونے کے لئے ہمارے پاس آنسو نہیں بچیں گے! کیا حسرتوں کا بھی قتل ہوتا ہے؟ ممکن تھا کہ میرے ذہن میں کبھی یہ خیال آتا؛ لیکن اس رات ہم نے ان کا جنازہ اپنی آنکھوں سے اٹھتے دیکھا تھا۔ بھلا سوچیے تو ایک شخص آپ کے سامنے ہو اور اختیار ہونے کے باوجود بھی آپ اس کو روک نہیں سکتے۔!۔!۔!۔!۔!۔!۔!۔!۔!........................

یہ اختیار بھی کیسی ان چھوئی شے ہے۔ کبھی ایسے آجاتا ہے کہ گویا سب کچھ ہمارا ہے اور کبھی ایسے جاتا ہے کہ اپنا آپ بھی بے قابو ہو جاتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ میں، میں ہی ہوں یا مجھ میں کوئی دوسرا وجود سرایت کر چکا ہے۔ یہ سارا منظر بہت ہی زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔ اب گویا ہماری زبانیں مقفل ہو گئیں کیونکہ اب اس سے زیادہ اپنی محبت کے خلوص کا ثبوت نہیں دیا جاسکتا تھا۔ آسیہ —— کا آفتاب کائنات کی گردش میں رنگ و روشنی بکھیرنے کے لئے چلا گیا۔ وہ نیچے نہیں آئی۔ اوپر ہی کھڑکی کی چوکھٹ پر اپنا سر رکھ کر راہ تکتی رہی۔ آفتابِ بام اس کی آنکھوں کے قریب -- بالکل قریب تھا۔ پھر وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ موہوم سایہ بن جاتا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس کے ارمانوں کی دنیا کوئی اپنے ساتھ ہی لے کے جارہا ہے۔ عبد الہادی —— کے ساتھ اس کی حِس اور دل کی دھڑکنیں بھی چُپ کے، خاموشی سے جاتی رہیں۔ ہاد —— وہ -- وہ -- ہاد ——، آس -- وہ، وہ -- آس، آس —— راس -- راس -- آس ——، راستہ -- آسیہ —— آسیہ ——، راستہ -- آراستہ -- راستہ - راستہ -- آہستہ - آہستہ -- دیکھتے ہی دیکھتے وہ آفتابِ حشر بن -- گیا اور اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک گپ اندھیرا چھا گیا۔ یہ محض فرقت کا اندھیرا نہیں تھا بلکہ رات نے اپنی چادر لہرائی تھی۔ امی نے آسیہ —— کے کمرے کا دروازہ کھولا ہو گا تو وہ کھڑکی کے قریب اس کی چوکھٹ پہ اپنا سر رکھے ہوئے یوں تو گہری نیند سو رہی ہو گی؛ لیکن درحقیقت وہ خوابوں کی دنیا میں میرے ساتھ ساتھ ہی میرا ہم سفر بن کے آرہی ہو گی۔ ہم اک دوجے سے کب جدا ہوئے تھے؟

☆☆☆

"جنت سے جہنم تک"

"وہ کون سی جگہ تھی؟"

مینڈھا نے اپنے والد بھیڑ سے سوال کیا۔

"وہ جہنم تھی!"

اس نے جواب دیا۔

"ممیں ممیں (یعنی بابابابا) کیا کہہ رہے ہو؟"

مینڈھا ڈر گیا۔

"ہاں سچ کہہ رہا ہوں؟ -- چہار سو تاریکی تھی، روشنی کا کوئی دھندلا سا نقش بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، اچانک سناٹے میں کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی، ساتھ ہی تیز تیز قدموں کی آہٹ۔ ہم اصطبلوں اور طبیلوں میں سہمے ہوئے کواڑوں کے پٹوں، کھڑکیوں اور روشنیوں ہی کو بند کیے نہیں تھے بلکہ اب سانسوں پر بھی قابو رکھنا پڑتا تھا کہ کہیں تیز سانس کی آواز باہر نہ چلی جائے اور یہاں سے گھسیٹ کر نکالا جائے۔ ہمارے ساتھ یہ عمل تواتر کے ساتھ دہرایا جا رہا تھا۔ ہر اسانی کی وہ کون سی کوشش تھی جو اپنائی نہ گئی ہو، جس کا اس تجربہ گاہ میں تجربہ نہ کیا گیا ہو۔ یہ ایک ایسا قصاب خانہ تھا جہاں ہم سے جس جانور کو جب دل چاہے ذبح کیا جا سکتا تھا۔ ہمیں اب اس پر اعتراض نہیں تھا کہ ہم بے دریغ قتل ہو رہے ہیں بلکہ یہ گلہ تھا کہ حلال طریقے سے ذبح نہیں ہو رہے ہیں۔

"ممیں ممیں! بتنگڑ بنا رہے ہو؟"

مینڈھے نے بے اعتباری سے میش کی بات کاٹ لی۔

"اگر تم نے، ہمیں پالنے والے بچوں کی زبانی، ناناجی کی کہی ہوئی دلیل سنی ہوتی تو ایسا شک تمہارے ذہن میں نہیں آتا۔"

بزرگ بھیڑ نے اپنے بچے کے سوال کا جواب دیا۔

"ممیں! پھر--- مجھے بھی سناؤ وہ کیا کہہ رہے تھے۔"

مینڈھے نے حیرت سے استفسار کیا۔

"بچے کہتے تھے، ناناجی کہتے تھے، کہ کہنے والے استاد کہتے تھے۔ سکون برباد (جو پہلے سکون آباد کہلاتا تھا) میں حالات روز بروز خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ ہر طرف درد بھری آہیں تھیں، پُر درد نالے تھے، یتیم بچوں، بیوہ بہنوں، اپنے بیٹوں سے محروم والدین کی پر نم فریادی آنکھیں تھیں۔"

"ممیں ممیں! کیا ایسا ہوتا تھا؟"

بچہ حیران ہو رہا اور گھبرا رہا تھا۔

"ہاں ناناجی نے کہا تھا": ناناجی اپنی رعب دار آواز میں کہتے تھے۔ ناناجی کی آواز طبلے کی تھاپ پر پڑنے والی گرجدار آواز تھی:

"سنو۔"

"روز جنازے اٹھے گیں---! مرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جائے گی۔---!

قبر اور کفن پہلے سے ان کے منتظر رہیں گے--! ہر علاقے کے لوگ انہیں اپنے یہاں

دفنانے کا تقاضا کریں گے --! جس سے کئی بار نزاع کی نوبت آئے گی --! اس لئے اس کا مناسب حل سن رکھو --- (ناناجی نے گرج -- لیکن متفکر ہو کر کہا) ہر قریہ میں مختص طور پر "مزارِ -- ش --- " بناؤ! تاکہ اس طرح کے مسائل کا سامنا کرنا نہ پڑے۔ گلی کوچے خون سے رنگین ہوں گے --! ہر رات کا معاملہ خوف، ہراس، ڈر اور ٹُھن ٹُھن کٹ کٹ گڑ گڑ کا ہو گا اور ہر دن کا مشغلہ قبریں کھودنے، غسل دینے، جنازے پڑھنے، رونے رلانے اور ماتم کرنے کا بن جائے گا۔ سکون آباد کی کھل کھلاتی ہنسی کا گلستان آہ وبکا کی آماجگاہ بن جائے گا۔ وہاں جو قہقہوں کے چشمے پھوٹتے تھے، اب مصیبتوں میں بھری خون کی ندیاں بہیں گی۔ وہاں جو کبھی توتلی زبانوں سے قرآن، حمد اور نعت کی آوازیں بلند ہوتیں تھی، اب نوحہ، مرثیہ اور ہجر کے نالے نکلیں گے۔"

"ممیں ممیں! بابان بابان -- نہ سناؤ -- نہ سناؤ -- ڈر لگ رہا ہے۔"

مینڈھا کانپ گیا۔

"بس مُنّے تھوڑا -- اور ہے۔"

"ماؤں کا انتظار بہت طول ہو گا۔ وہ ہر دن اور ہر شام جب برتنوں میں کھانا پروسیں گی !توکسی کے برتن پر جا کر، ہاتھ رکیں گے اور خیالوں کی دنیا میں کسی چہرے کے دلآویز خطوط آجائیں گے !وہ بچپن کی ممتا، وہ لاڈلا پن وہ توتلی باتیں، وہ شرارتیں اور نہ جانے کیا کیا ----- بے درد انتظار طویل اور طویل ہو گا! باپ جب اپنے بچوں کے لئے کھلونے نہیں لاسکیں گے اور اگر لائیں گے تو ان کی آرزؤں کا خون ہو گا -----؟ ان کی بہنیں جب برتنوں کو مانجھیں گی یا، کپڑوں کو دھوئیں گی تو ان کے سامنے یادوں

کے کئی جہاں وا ہوں گے۔ انہیں اس کی خبر بھی نہیں ہوگی کہ ان کی آخری امید ٹوٹ بھی گئی کہ باقی ہے۔

سب کو ٹھِٹھرتی سردیوں میں صبح سویرے اپنے گھروں سے نکلنا پڑے گا-- ! زیارت گاہیں جلائی جائیں گی، مسجدیں اذان اور نماز کے بجائے میدان میں حاضر ہونے کے اعلان کے لئے رہیں گی۔ اذان کی آواز سن کر کم ہی لوگ اس پر لبیک کہیں گے مگر اعلان سن کر سب کو حاضر دربار ہونا پڑے گا۔ پھر گالیوں، تھپڑوں، لاتوں، لاٹھیوں، مار ڈھاڑ کا سلسلہ چل نکلے گا؛ جو کبھی تو اسی پر رک کے رخصت ہوگا اور کبھی ظلم کی تاریک کوٹھریوں، اذیت کے سخت کٹہروں، تعذیب کے سیاہ گھڑوں پر جا کے تھم جائے گا۔ کبھی خون سے اپنے ہاتھ رنگ کے تسکین پائے گا، سولی پر لٹکا کے خوش ہوگا، اپنی تلوار کی دھار آزما کر مسکرائے، نیزے سے بدن چھلنی کر کے اپنی پیاس بجھائے گا۔ ان تھپڑوں سے گال سرخ ہو جائیں گے، لاتوں سے رانیں درد کریں گی۔ لاٹھیوں کے وار سے ٹیسیں اٹھیں گی۔ خنجروں کے زخموں سے خون رِسے گا۔ شعلوں اور شراروں کی جلن تڑپا دے گی۔ تپتی سلائیوں سے کیے جانے سوراخ بلبلائیں گے۔ ہزاروں انسان عمر کے بلا کسی امتیاز کے اس عمل سے گزارے جائیں گے۔"

بچے کا خون خشک ہو رہا تھا۔

"ممیں ممیں! کیا ایسا ہوگا؟"

بچے کہتے تھے ناناجی صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ ان کی بہت سی باتیں سچ ہوئی ہیں۔ خود ہم نے جو دیکھی ہیں۔

یوں سکون آباد سکون برباد بن گیا اس کے باسیوں کے ہاتھوں میں تتلیوں کے بجاے تلواریں تھم گئیں، کھیل کے میدان رزم کے میدان میں بدل گئے، ملن جدائی پر منتج ہوا۔

آسمان سے کڑاکے کی آواز گونجی۔ بجلی کی ایک تیز رفتار برق کواڑوں کو چیرتی ہوئی طویلے میں پہنچ گئی۔

"ممیں ممیں! بابا جان بابا جان بس بس مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے اپنی آغوش میں لے لو۔ مجھے لوری سناؤ۔"

ہاں ہاں میرے مُنّے سنو ہم یہ لوری مل کر گا رہے تھے تم بھی میرے ساتھ گاؤ:

"للاللا لوری دودھ کی کٹوری"

---یہ کس نے تھما دی ہیں؟

میرے ہاتھوں میں تلواریں!!!

نفرت کے زہر سے بھرے جذبے!!!

دلوں میں کس نے انڈیل دیے؟

میرے کانوں میں مدھر لوری تھی

زباں پہ میٹھے بول تھے

میرے پاس کھلونا تھا

مینڈھا، میمنا کی سواری تھی

پنچھی میرے دوست تھے

میں تتلیوں کے پیچھے چلتا تھا
میرے گانوؤں کی سوندھی مٹی کے
کھیت، پھولوں سے لہلہاتے تھے
خاموش، پرسکوں گلیاں تھیں
آنگن آنگن خوشی تھی
صحن صحن گل و گلزار
میری تتلیوں کو کس نے اسیر کیا——
پنچھی پابند سلاسل ؟
میرے مینڈھا، میمنا کیوں ذبح ہوئے؟
گانوؤں کی سوندھی مٹی کو
سرخ، رنگین کیا، کالک ملی؟
وہ کھیت کیوں کر اجاڑے ؟
ہنگامہ کیوں برپا ہوا؟
جہاں آنگن آنگن خوشی تھی!
وہاں صحن صحن کیوں ماتم ہے ؟
اے میری پیاری بستی بول——————؟
تمھیں یاد ہے کچھ——————!!!
لوگ تمھیں جنت کہتے

_____ تھے؟/_____/

_____ ہیں/_____؟؟؟؟؟

یہ کس کی نظر بد نے _____؟

تجھے جہنم بنادیا _____!!!

"ٹیونکل ٹیونکل لیٹل سٹار۔۔۔۔۔!"

پھر سے کتوں کے بھونکنے کے ساتھ ہی تیز تیز قدموں کی آہٹ بھی تیز تر ہوتی گئی۔ اور اندر بیٹھے بھیڑوں اور مینڈھوں کی دھڑکنیں بھی تیز ہو رہیں تھیں۔ ان کے دل و دماغ میں ہزار طرح کے وساوس آرہے تھے۔ وہ اپنی باری کے بارے میں خوف کے مارے کانپ اٹھتے تھے جب ان کی گردن زنی کا حکم ہوگا۔ روز روز کے اس خوف نے ان کا خون خشک کیا تھا۔ وہ صرف زندہ رہنے کا نام جانتے تھے مگر عملی تجربہ وہ موت اور صرف موت کا ہی کر رہے تھے۔ وہ ہر روز ایک نئی موت مر رہے تھے۔ ہر نئے دن کو گزارنے کے لئے انہیں پہلے موت کے آنگن سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ بے درد قصائی کیا جانے پیڑ پرائی۔"

ماچہ میش کے حلق سے افسردہ چیخ نکلی۔

کچھ دیر بعد ہی کہیں سے کٹاریوں کے ٹُھننے کی آواز آئی۔ مینڈھا ڈر کر پدر کو چھوڑ مادر کی آغوش میں چلا گیا۔ پہلے ایک ٹُھن پھر دوسرا اور اس کے ساتھ ہی ٹُھن ٹُھن ٹَھن ٹَھن کی مسلسل آوازیں آنے لگیں۔ تقریباً یہ سلسلہ تین گھنٹے تک مسلسل چلتا رہا پھر اچانک رک گیا۔ بکریاں مرغزاروں میں چر رہی تھیں۔ بھیڑ طویلوں میں گھاس کھا

رہے تھے۔ سہمے ہوئے بیٹھے مختلف قسم کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ آوازوں کا گلا کاٹ دیا گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ثابت قدمی اور حفاظت کے لئے دعائیں کرنے لگے۔ انہیں یقین تھا کہ دعاؤں سے تقدیر بدل جاتی ہے مگر ایک طویل زمانے سے ان کی دعاؤں کی تاثیر رنگ نہیں لارہی تھی۔ اس پہ تاثیر کے پر لگ نہیں پاتے تھے۔ یہ اثر کے رس سے خالی، بے جان اور خشک تھی ان کے جسم میں خون کی طرح شاید یہ بھی انتہائی خوف کا شکار ہوگئی تھی اور بارگاہ ایزدی میں جانے سے ڈر رہی تھی۔

پون گھنٹے کے بعد ٹَھن ٹُھن کا سلسلہ پھر سے شروع ہوگیا کٹاریوں کی گھن گرج سے چنگاریاں نکلنے لگیں اور ان چنگاریوں سے آگ کے شعلے ---- بلند ہوئے اور رات کے اختتام کے ساتھ ہی اختتام پذیر ہوئے۔ صبح اس خبر کی تصدیق ہوئی کہ تین دارِ آخرت کو کوچ کر گئے ہیں۔ لوگ ان کو ملبے سے نکال رہے تھے۔ تینوں کا جسم جل چکا تھا۔ ان میں ہشام بھی تھا؛ جو آخر کار اپنی بیٹی آمنہ اور اس کی امی اسما کو دیکھے بغیر چلا گیا۔ باقی دو کی شناخت نہیں ہو پارہی تھی کہ وہ کون ہیں؟ ابھی تک نہ جانے کتنے ایسے پر اسرار جانباز تھے جو معمہ بن کر رہ گئے۔ جن کی شناخت نہیں ہو پائی تھی۔

"ممیں ممیں! میرا خون خشک ہوگیا۔ مجھے دودھ پلاؤ۔"

گوسفند دودھ پینے بیٹھ گیا۔

" سکون آباد کی داستانیں " میں کہاں آپ کو اس کتاب میں لکھی گئی فوق الفطری کہانیاں سنانے لگا! کہ اس میں کھو کر میں آپ کو آسیہ ــــــ کے متعلق مزید بتانا بھول ہی گیا۔

کٹاریوں کی ٹھن ٹھن کی چنگاریاں اور ان چنگاریوں سے نکلنے والے شعلوں کی لپیٹیں میرے گھر تک بھی پہنچ چکی تھی اور میرا گھر "سر فروش منزل" آگ کی لپیٹ میں آکر نیست و نابود ہو چکا تھا۔ وہ سب ساز و ساماں، میری کتابیں، کپڑے اب کچھ بھی نہ رہا تھا۔ میری ساری دنیا لٹ چکی تھی۔ میرے پاس خود اور مہدی کے سوا کچھ بھی نہ رہا تھا۔ خیر یہ چیزیں تو میں بازار سے لا سکتا تھا۔ امی میرے دردِ فرقت میں پہلے ہی بہت نحیف ہو کر زندگی کے ساتھ زیادہ مقابلہ نہ کر کے راہ عدم کو سدھار چکی تھی۔ چھوٹا بھائی مسلسل تعذیب کی وجہ سے مہلک بیماریوں میں مبتلا ہوا، آخر کار ٹیومر کا شکار ہو کر اپنی جان سپرد کر چکا تھا۔ اب ابو، بہن اور آسیہ —— تھے سو وہ بھی راکھ کا ڈھیر بن گئے تھے۔ انہیں میں کس بازار سے لاتا؟ کس دکان سے خریدتا؟ کس گھر میں ڈھونڈتا؟ کس گلی میں تلاش کرتا۔۔۔۔؟

آسیہ —— جو ہمیشہ کالا برقعہ پہنتی تھی۔ اس کے نیچے سبز رنگ کے دوپٹّے کے حلقے آنکھوں سے لگ کر اس کو کسی حور پری جیسی رنگت بخشتے تھے۔ آج آسیہ —— خود کالا برقعہ بنی ہوئی تھی۔ وہ چاند جیسی آنکھیں اور پری جیسی رنگت بھی کالی ہو گئی تھی۔ گویا اس وقت بھی اس نے پردے کا اہتمام کیا تھا! میری بہن مزاقاً اس کو "رابعہ بصری" کہتی تھی۔ نماز چھوڑنے، روزہ ترک کرنے، اللہ اور حضور پاک ﷺ کے کسی حکم کے خلاف کرنے پر آسیہ —— ان کو ڈانٹ پلاتی۔ اس معاملے میں وہ آسیہ —— سے خائف رہتی تھی۔ وہ اکثر ہنسی کھیل میں ان سے کہتی تھی:

"باجی نے ہمیں بھی رابعہ بنانے کا ارادہ کیا ہے۔"

"کیوں نہیں، تمھیں تو میں اماں فاطمہ رضی اللہ عنہا اور اس کے نقش قدم پہ لانا چاہتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ان کی بولی بند کر دیتی۔ ایک بار راستے میں جام لگنے کی وجہ سے میری مغرب اور عشا کی نماز جاتی رہی۔ میں دس بجے گھر پہنچا اور سیدھا باورچی خانے میں کھانا کھانے کی غرض سے گیا کہ مجھے زوروں کی بھوک لگی تھی۔ آسیہ ـــ اس وقت نماز پڑھ رہی تھی اور اللہ کے حضور سجدے میں تھی۔ اس کے گرد مجھے نور کا ایک ہالہ نظر آیا۔ اس کی عبادات و ریاضت میں ایسی حضوری اور خشوع و خضوع تھا کہ مجھے اپنی تمام عبادات اُس کے سامنے ریا معلوم ہوتی تھیں۔ اللہ اس سے کتنے خوش ہوتے ہوں گے --! سلام پھیرنے کے بعد وہ دعا میں منہمک ہو گئی:

"اے اللہ تمام حمد آپ کو ریبا ہیں، ہماری طرف سے اپنے پیارے حبیب ﷺ پر رحمت بھیج دیجیے۔"

"اے ہمارے پروردگار آپ نے اس (دنیا) کو لایعنی پیدا نہیں کیا ہم آپ کو منزہ سمجھتے ہیں سو ہم کو عذاب دوزخ سے بچا لیجیے۔ اے ہمارے پروردگار بے شبہ آپ جس کو دوزخ میں داخل کریں اس کو واقعی رسوا ہی کر دیا۔ اور ایسے بے انصافوں کا کوئی بھی ساتھ دینے والا نہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم نے پکارنے والے کو سنا کہ ایمان لانے کے واسطے اعلان کر رہے ہیں کہ تم اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ سو ہم ایمان لے آئے۔ اے ہمارے پروردگار پھر ہمارے گناہوں کو بھی معاف فرما دیجئیے اور ہماری بدیوں کو بھی ہم سے زائل کر دیجئیے اور ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ موت دیجئیے۔ اے

ہمارے پروردگار اور ہم کو وہ چیز بھی دیجئیے جس کا ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت آپ نے وعدہ فرمایا ہے اور ہم کو قیامت کے روز رسوانہ کیجئیے۔ یقیناً آپ وعدہ خلافی نہیں کرتے۔"

"اے اللہ! ہم مسلمانوں کے دلوں میں آپس کی الفت و محبت پیدا فرما دے، اور ہمارے آپس کے احوال درست فرمادے، اور ہمیں سلامتی کے راستے دکھا اور ہمیں تاریکیوں سے نجات دے کر روشنی کی طرف لا، اور ہمیں ظاہری اور باطنی ساری برائیوں سے بچالے اور ہمارے لئے برکت فرما ہمارے کانوں میں اور آنکھوں میں اور دلوں میں اور ہمارے گھر والوں میں، اور ہماری توبہ قبول فرما بے شک تو بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا ہے، اور ہمیں اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا اور ان کو اچھی طرح قبول کرنے والا بنا، اور ان نعمتوں کو ہم پر پورا فرمادے۔"

"اے اللہ! بے شک تو میرا ظاہر حال بھی جانتا ہے اور باطن بھی، لہٰذا میری معذرت قبول فرما اور تو میری حاجات بھی جانتا ہے لہٰذا میرا سوال پورا فرمادے اور تو میرے اندر کا حال بھی جانتا ہے، لہٰذا میرے گناہ معاف فرمادے، اے اللہ میں تجھ سے ایسے ایمان کا سوال کرتی ہوں جو میرے دل میں سما جائے اور یقین صادق کا سوال کرتی ہوں تاکہ میں یہ بات اچھی طرح جان لوں کہ مجھ کو وہی نفع و نقصان پہنچے گا جو تو نے میرے لئے لکھ دیا ہے پس مجھ کو راضی رکھ میری قسمت پر، اے عظمت والے اے احسان والے۔"

"اے میرے رب کتنی ہی ایسی نعمتیں ہیں جو تو نے مجھ کو عطا کیں لیکن میری طرف سے ان کے شکر میں کمی ہی ہوتی رہی اور کتنی ہی ایسی مصیبتیں ہیں جن میں تو نے مجھ کو مبتلا کیا (میری آزمایش کے لئے) لیکن میری جانب سے ان پر صبر کرنے میں کمی ہی ہوتی رہی، پس اے وہ کریم ذات جس نے مجھ کو میری ناشکری کے باوجود محروم نہیں رکھا، اور میری بے صبری کے باوجود اپنی نصرت اور مدد کو مجھ سے نہیں روکا، اور اے وہ ذات جس نے مجھ کو معاصی پر دیکھنے کے باوجود رسوا نہیں کیا اور اے وہ محسن جس کے احسانات کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں، اور اے وہ منعم جسے کے انعامات کو شمار نہیں کیا جاسکتا، میں تجھ سے یہ دعا کرتی ہوں کہ تو ہمارے سردار محمد ﷺ پر اور آپ کی آل اولاد، اور اصحاب پر اور آپ کی اتباع کرنے والوں پر ہمیشہ ہمیش اپنی خاص رحمتیں نازل فرما۔"

"اے اللہ! میں تیری بندی ہوں اور تیرے بندے کی بیٹی ہوں، اور تیری ہی بندی کی بیٹی ہوں، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے، تیرا ہی حکم میرے بارے میں چلتا ہے، تیرا فیصلہ میرے بارے میں (جو بھی ہو) وہ عدل وانصاف ہے، دعا کرتی ہوں میں تجھ سے تیرے ہر اس نام سے جو تو نے خود لیا ہو یا وہ نام تو نے اپنی کسی کتاب میں نازل فرمایا ہو، یا وہ نام تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہو، یا وہ نام تیرے پاس تیرے علم غیب میں ہو (کسی کو تو نے بتایا نہ ہو) یہ دعا کرتی ہوں کہ آپ قران کریم کو میرے دل کی بہار بنادیں اور اس کو میری آنکھ کی روشنی بنادیں، اور میرے سینے کی شفا بنادیں اور اس کو میرے غم اور فکر کے دور ہونے کا ذریعہ بنادیں۔"

"اے اللہ مجھے علم، متانت، حلم، فہم، سنجیدگی، بردباری، کم گوئی، تواضع، عاجزی، انکساری نصیب فرما۔"

"اے اللہ! امتِ مسلمہ کے حال پر رحم فرما، ہماری نصرت فرما ہمیں فتح نصیب فرما، ہمارے قدموں کو ثابت قدمی عطا فرما اور اپنے دشمنوں کے قدموں کو اکھاڑ دیجیے۔"

"اے اللہ ہم عورتوں کو سادگی، پاکیزگی اور عفت نصیب فرما۔ ہمیں بھی مردوں کے دوش بدوش اسلام کی بے لوث خدمت کرنے کی توفیق نصیب فرما۔ ہمارے اندر اپنے دین کی خدمت اور اس کی سربلندی کے جذبے زندہ فرما۔ ہمارا رخ دنیاوی زیب و زینت سے موڑ کر اپنی طرف پھیر دے۔"

"اے اللہ! حصولِ مقصد کے لئے ہم نے اپنا بہت کچھ نثار کیا، اب ہمیں آزاد فضاؤں، حسین بہاروں، کھلے مرغزاروں، بے قید آبشاروں کی نعمتوں سے سرفراز فرما۔"

"اے اللہ! میرے ابو کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرما۔ ہم سب کو اپنی اور اپنے حبیب ﷺ کی محبت اور دیدار کا شوق نصیب فرما۔"

"اے میرے اللہ میرے ہادو کو سلامت رکھ، ان تک کوئی آنچ نہ پہنچے، جو آنچ، جو تپش، جو مصیبت ان کی طرف رخ کرے اس کو دوسری طرف موڑ دیجیے۔ ہادو نے جو اعتماد مجھ پر کیا ہے اس اعتماد پر مجھ کو پورا اترنے کی توفیق اور ہمت عطا فرما، جو خواب انھوں نے مجھ سے وابستہ کیے ہیں ان خوابوں کو حسن تعبیر عطا فرما، ان کے عزائم کو پختگی، مقاصد کو رفعت، قلب کو نورانیت و بصیرت، ذہن کو راست فہم کی صلاحیت، آنکھوں کو فراست، زبان کو فصاحت، کانوں کو حق سماعت عطا فرما۔ آپ ہر گام پر اس

کو فاتح بنا دیجیے، میری عمر میں بھی اس کو حصہ دیجیے تاکہ وہ اپنے مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ ان سے پہلے مجھے اپنا دیدار نصیب کیجیے۔ میرے اللہ، میرے اللہ، میرے اللہ، میری دعاوں کو قبول فردیجیے، آپ ہی کا فرمان ہے۔ "جب پکارنے والا مجھے پکارتا ہے پس میں اس کو سن لیتا ہوں۔" بے شک آپ میری اس پکار کو، میری اس فریاد کو، میری اس الحاو زاری کو سن رہے ہیں۔ مجھ سائل کو اپنے دربار سے خالی ہاتھ نہ لوٹا دیجیے! آپ کا ہی ہمیں حکم ہے کہ "اور سائل کو نہ جھڑکو، آپ غنی ہیں، فیاض ہیں، میرے اللہ، میرے اللہ، میرے اللہ۔۔۔۔۔۔"

وہ دعا میں بھی ایسی عاجزی وانکساری کرتی تھی کہ کئی بار مجھے ان کی حالت کو دیکھ کر رحم آتا تھا۔ اس وقت مجھے اس کے رونے کی وجہ سے اس پر ترس آیا۔ میں نے قدرے زور سے آ۔۔۔۔۔ مین کہا۔ آسیہ ۔۔۔ چونکی۔ آنسو اس کے گلابی رخسار پر نور کی شعاعیں بکھیر رہے تھے۔ اس نے چہرہ پونچھ لیا اور اپنی دعا مختصر کر کے مجھے سلام کیا۔ "السلام علیکم"!

"وعلیکم السلام، (میں نے اس کو محسوس نہ ہونے دیا کہ میں اس کی تمام دعائیں سن چکا ہوں۔) آس۔۔۔ بھوک تیز لگی ہے مجھے کھانا دو۔"

مگر اس نے پہلے نماز پڑھنے کی شرط دھاک دی۔ کتنی پیاری آواز میں اس نے کہا تھا، یہ آواز آج بھی میرے کانوں میں رس گھولتی ہے۔

"پہلے نماز پڑھ لو پھر کھانا ملے گا، نماز کے بغیر اس گھر میں کھانا۔۔۔!"

میں اس معاملے میں آسیہ ـــ کے نافذ کردہ قانون کو جانتا تھا اس لئے جلدی اٹھ کے وضو کیا اور نماز پڑھ لی۔

"اب تو کھانا ملے گا؟"

"کیوں نہیں کچھ اور بھی کھانا چاہو تو وہ بھی ملے گا۔"

"کیا آج کچھ خاص بنایا ہے؟"

"تمہارے لئے میں نے "کدو کا حلوہ" بنایا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ ایں جناب کو میری پسند کا کتنا خیال ہے۔ ابھی تو کھانا تک بھی نہ ملتا تھا۔" میں نے طنزاً کہا۔

"ہاں ـــ مجھے پتہ ہے کہ سفر سے لوٹنے کے بعد تھکان کی وجہ سے تمھیں زوروں کی نیند آتی ہے اور تمہاری نماز چھوٹ جاتی ہے اس لئے میں نے ایسا کیا۔"

"تمہاری یہی ادائیں تو مجھے فریفتہ کیے ہوئی ہیں۔"

میرے اس بے ساختہ جملہ کی وجہ سے اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔

"چلئے چھوڑیے آپ کو تو ہر موقع پر میری تعریف کا کوئی بہانہ ملنا چاہیے۔"

"اللہ نے تمھیں تعریف کے لائق بنایا ہے۔ تمہاری وجہ سے اللہ نے مجھے دنیا کی عظیم دولت عطا کی ہے اپنی اطاعت اور حضورِ پاک ﷺ کی فرمانبرداری۔ لوگ تو ان عورتوں کی تعریف کرتے ہیں جو اللہ سے روگردانی اور حضور ﷺ سے دوری پیدا کردیتی ہیں۔ پھر میں تمہاری تعریف کیوں نہ کروں؟"

"مجھ سے، تمہارے حسن ظن نے، مجھے بھی تمہارے لئے سراپا اخلاص وایثار بنایا ہے۔

تم جیسے پر خلوص شوہر تو خوش نصیب عورتوں کو ہی مل پاتے ہیں؟"

"اور آسیہ —— جیسی دلھنیں بھی تو اعلیٰ نصیبوں کو ہی حاصل ہوتی ہیں۔"

"ہاں —— تم سے جیتنا آسان نہیں حقیقت دراصل یہ ہے:

"الخبيثات للخبيثين والخبيثون للخبيثات و الطيبات لطيبين، والطيبون لطيبات " (النور)

اب آگے میں کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ آسیہ —— نے ملن کا بہترین فیصلہ کیا تھا۔ اب آسیہ —— کہاں تھی؟ اس کی باتیں تھیں نہ اس کی نصیحتیں، وہ چھوٹی سی آسیہ —— قبر کے بڑے ڈھیر میں کہاں سما گئی؟:

یہ سارا گھر کہ معطر تھا تیری باتوں سے

یہ سارا شہر کہ روشن تھا تیرے ہونے سے

یہ زیورات کہ تیرے بدن سے چمٹے تھے

حسین اگر تھے تو بس اس لئے کہ تونے انہیں

پہن لیا تھا وگرنہ یہ کیا تھے، کچھ بھی نہ تھے

یہ کہکشاں تھی فروزاں کہ تونے رات گئے

نظر اٹھا کے اسے اک بار دیکھا تھا

ستارہ صبح کا خوش تھا کہ تیری پلکوں نے

اسے سنبھال لیا تھا کمال نرمی سے

وگرنہ خاک پہ گرتا تو خاک ہو جاتا

مرے قلم میں روانی ترے ہی دم سے تھی

جو تو نہیں ہے تو اب یہ قلم بھی بے بس ہے!

آگ کی لپیٹوں میں آکر میرے گھر سے بیک وقت تین لاشیں اٹھیں۔ یہ میرے ہی گھر کا حال نہ تھا ساری بستی کا حال تھا؛ بلکہ ہر جگہ آگ کی یہ لپیٹیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جو جل کر ناخیز ہوئے ان کو ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ ان میں کچھ لوگ چند دن زندگی اور موت کی کشمکش میں زندگی سے ہمت ہار کے موت کی آغوش میں چلے گئے۔ خدا ان پر رحم۔۔۔! کرے انہیں نہ جانے یہ کیونکر معلوم ہو گیا تھا کہ میرے گھر والوں خصوصاً آسیہ —— کا فاتحہ پڑھنے کے بعد میرے سارے حذبے ناکام ہو جائیں گے اور مری ساری ہمت ٹوٹ جائے گی۔ ان کا یہ اندازہ بالکل صحیح تھا۔ میں اب کیارہ گیا تھا جسد بے جان! ایسا شخص جو ہاتھ پانوؤں سے معذور تھا؛ جس کی آنکھیں تو تھیں مگر وہ ان سے دیکھ نہ پاتا تھا، جس کی زبان تو تھی لیکن بول نہ پاتا تھا، کان تھے البتہ کچھ سننے سے قاصر، ٹانگیں تھیں مطلق چلنے سے معذور، ہاتھ تھے مگر کچھ کرنے سے عاری، دل تھا مگر دھڑکن سے خالی، دماغ تھا پر سوچ سے ماؤف۔ میں کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں کون تھا؟ مجھ سے تو میری شناخت ہی چھن گئی تھی۔ میری پہچان ہی مٹ گئی تھی۔ میری روح تو کہیں تھی ہی نہیں وہ تو ابو، بہن اور آسیہ —— کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ میری تو اب ڈھارس باندھنے والا کوئی تھا نہ ہی کاندھا تھپتھپانے والا۔ اگر مہدی نہ ہوتے تو میرے لئے اس حادثہ جانکاہ سے نبرد آزما ہونا ممکن نہ تھا۔ شاید میرا جسم بھی ان کے

ساتھ ہی قبر میں اتر چکا ہوتا۔ "سرفروش منزل" اور اس کے مکینوں کے ساتھ ہی میری ساری دنیا ملیامیٹ ہو چکی تھی۔ پھر آسیہ ــــ نے تو مجھ سے میرا سارا بچپن ہی چھین لیا تھا۔ میں اب بھی ان کو چھیڑ خانی کے لئے وہ سب واقعات یاد دلاتا تھا نیز کبھی کبھی اُس سے کھیلنے کی فرمائش بھی کرتا۔ وہ ہر دفعہ اپنی رسیلی آواز سے "ہٹ شرارتی" کہہ کر اور معصوم سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر ٹالتی تھی۔ آسیہ ــــ کا ہر وار میرے لئے مرہم تھا جس کی اب میں شدّت سے تمنا کرتا ہوں۔ آج بھی جب میں ان واقعات کو یاد کرتا ہوں تو بہت راحت محسوس کرتا ہوں؛ اور آسیہ ــــ بڑی شدّت سے یاد آتی ہے !!!! کاش ایک بار ہی وہ کہیں آگے سے -- یا پیچھے سے -- یا دائیں سے -- یا بائیں سے -- صرف ایک بار -- بس ایک لمحہ -- اور ایک وقفہ -- آجائے محض -- ایک جھلک -- دکھائے ---!

اب موت میں بھی آسیہ ــــ نے مجھ سے پہل کر بازی لے لی۔ نہ جانے میں ہر بار آسیہ ــــ کے سامنے کیوں ہار جاتا تھا؟ میں زندگی بھر ان سے بہت کم جیت پایا وہ ہمیشہ ہی مجھ پر چھائی رہی۔ روحوں کا یہ سنگم قدرت نے ازل سے ہی جوڑا تھا اسی وجہ سے وہ میری روح پر بھی ہمیشہ چھائی رہی۔ میں تو آج بھی خود کو اس سے جدا نہیں سمجھتا۔ وہ یہی کہیں -- ہر دم -- ہر وقت -- میرے آس پاس رہتی ہے۔ وہ میری جدائی کے صدمے کو برداشت نہ کر پائی اِس لئے اُس نے پہلے ہی جسم کی قید سے آزاد ہو کر خود کو میری روح میں تحلیل کر لیا۔ اور! میں ناتواں اب تک نہ جانے کس گھڑی کا انتظار کر رہا ہوں؟ آسیہ ــــ نے میری وفاداری کا ہر عہد نبھایا! مجھے آسیہ ــــ پر فخر ہے۔

صرف دو چیزیں تھیں جو میری کل میراث میں بچ گئیں۔ مہدی اور کچھ خط۔ ایک انسانوں میں، ایک اشیا میں۔ مہدی ناںھیال میں تھا ورنہ وہ بھی ان کے ساتھ راکھ کا ڈھیر ہوا ہوتا اور خط، دو دن پہلے ارسال ہوئے تھے۔ ان خطوط کے مضامین دل کو تڑپانے والے تھے۔ آسیہ ــــ کی تحریر دل کو موہ لینے والی اور خون کے آنسو رلانے والی ہوتی تھی:

بنام: دل کے قرار عبدالہادی!!!

از طرف: آسیہ عبدلہادی

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

ہر ایک آہ پہ تیرا نام آتا ہے

میں یہ نہیں کہتی ہر گھڑی یاد ہو

آپ کی یاد "مہجور ہائے دل" کو اس طرح آتی ہے جیسے کسی صحرا میں تنہا کوئی درخت ہو۔ پھر تیز ہوا چلے اور ہر سمت سے اس پیڑ کو گھیر لے۔ اس کی شاخوں کو یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں اتنے زور سے مارے کہ اس بے چارے کا پھر سنبھلنا مشکل ہو جائے؛ مگر بے درد ہَوا تمہاری یاد کی طرح رکتی نہیں، بلکہ مسلسل چلی آتی ہے۔ ہاد ــــ میرے فرہاد ــ وقت کی بلاخیزی نے اس طرح جدا کر دیا کہ تیرا چہرہ اماوس کا چاند بن گیا ہے۔ اک جھلک دیکھی تھی وہ بھی ادھوری اور دو سال اب جدائی کو ہو گئے۔ اس "فرقتِ سُر خاب" میں ہونا چاہیے تھا کہ آپ کو روز بھول جاتے پر یہاں

معاملہ الٹا ہے۔ آپ کی یاد دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہے۔ میرا دل تمہاری جدائی کے صدمے سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گر نالہ سرخاب کر رہا ہے۔ میں تیرے فراق میں سوختہ ہو چکی ہوں، مجھے ہر لمحہ، ہر پل، ہر وقت تیرا ہی خیال آتا ہے، میرا کلیجہ تمہیں دیکھنے کے لئے پھٹ جاتا تھا۔ اچانک --- کہیں سے تمہارا سایہ نمودار ہوتا ہے! میں تمہارے سائیوں کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں اپنے گھر کی دیواروں کی تنہائیوں سے تمہاری کھکھلاتی ہنسی کی سرگمی آواز، تمہارے قہقہوں کی مدھر لے سنتی ہوں۔ میں تجھے آواز دیتی ہوں، ہادو۔ ہادو !! پھر خیالوں ہی خیالوں میں تمہاری آوازیں سنا کرتی ہوں، تمہاری مسکراہٹوں کے ساتھ میں بھی ہنس دیتی ہوں مگر میری ہنسی کے ساتھ ہی تمہاری مسکراہٹیں غائب ہو جاتی ہیں۔ کیا --؟ سایہ کبھی کسی کی گرفت میں آیا ہے؟ نہیں --- ایسا زمانے میں آج تک ہوا نہیں ہے۔ میں سوچتی ہوں۔ پھر کیا تم سایہ ہو؟ اگر سایہ ہو تو پھر کیوں تمہیں میں پکڑنے کی کوشش کرتی ہوں --؟ مگر -- نہیں! تم تو ایک حقیقت ہو، جس کو میں نے اپنے خوابوں کے جہانوں میں پاس -- بالکل پاس پایا تھا۔ بڑی منتوں سے مانگا تھا۔ پھر اللہ نے تمہیں میری جولی میں ڈال دیا تھا۔ تم مجھے مل گئے تھے۔ مگر -- ! مل کے بھی -- تم مجھے نہ مل سکے۔ میں نے اپنی ساری زندگی تمہارے نام لکھی -- اپنے خوابوں کے دروازوں کو بند کیا -- اپنی خواہشوں کو دفن کیا، اپنے ارمانوں کو کفن پہنایا۔ میں نے اپنے آپ کو تم میں ضم کر دیا۔ میں تم سے دور کیسے جا سکتی ہوں؟ میں تمہاری یادوں کی پرچھائیوں کو دیکھتی ہوں اور انہی کے سہارے اپنی زندگی گزار رہی ہوں۔ مجھے تو کوئی نامہ بر بھی نصیب نہ ہوا اور کوئی قاصد مقدر میں تھا

نہیں۔ ایسی حالت میں دل کے جذبات کیا کرتے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ ارمان بن جائیں۔ جب آپ کو میری حقیقت حال سے واقفیت ہو جائے گی اور اصلیت کا پتہ چل جائے گا تو زور زور سے زار زار روؤ گے۔ شاید وقت گزر گیا ہو گا۔

والسلام 12، ربیع الاول 1413ھ

ان سے کہیے آ کے ملئے ہم نہ کبھی پھر ملنے کو ہیں
میرے بلبل اگلے برس یہ پھول نہیں کھلنے کو ہیں

ہاد میرے فرہاد ——— ابھی بھی محبت کے زخم تازہ دم ہیں؛ ابھی وہ ہرے بھرے ہیں، ابھی ابھی تو انھوں نے اپنی انکھیں کھولیں ہیں۔ ابھی ابھی ان بیجوں کی کونپلیں نکلیں ہیں، ابھی ابھی ان کے پھول کھلے ہیں، ابھی ابھی تو ان پہ بہار آئی ہے، ابھی ابھی تو انھوں نے اپنا رنگ بکھیرنا شروع کیا۔ ابھی ابھی تو بلبل سے ان کا وصال ہو کر انھوں نے اپنا راگ چھیڑا ہے۔ ان کی کُویل ابھی ابھی کو کنے لگی، فاختہ گنگنانے لگی ہے۔ ابھی ابھی یہ زخم لگے ہیں، ابھی ابھی ان سے خون رسنا شروع ہوا ہے۔ ابھی تو کچھ ہوا ہی نہیں، ابھی تو محبت کے سارے زخم تازہ ہیں۔ میں یہ سب زخم تم کو سونپ رہی ہوں؛ جو میں نے اپنے دل میں پال رکھے ہیں۔ یاد رکھنا ان زخموں کو مندمل نہ ہونے دینا ان سے خون رِستے رہنے دینا۔

والسلام، 1 / شوال المکرم، 1413

ہم جان دیں گے اسی اعتبار پر
آپ آئیں گے ضرور مرے مزار پر

عبد الہادی ——— مہدی اب چھ مہینے کا ہو گیا ہے۔ تمہارے نام کی نسبت سے میں نے اس کا نام محمد مہدی رکھا ہے۔ تم عبد الہادی یہ محمد مہدی۔ گویا اللہ نے تمہارا بدل مجھے عطا فرمایا ہے۔ مہدی نجات دہندہ بن کر آئے گا۔ جو دنیا میں اسلام کی بہاریں پھیلائے گا۔ کیا تمھیں اس کو دیکھنے کی خواہش نہیں ہوتی؟ شباہت میں مجھ پہ گیا ہے پر آنکھیں تمہاری جیسی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے میرے بجھتے دل میں امید کی کرن جاگ جاتی ہے۔ میں ان میں مستقبل کے وہ خواب دیکھتی ہوں جو تم نے مجھے سونپے تھے۔ اور تیرے فراق نے جو درد مجھے دیا ہے اس کا کچھ مداوا ہو جاتا ہے۔ میں جب مہدی کی توتلی باتوں اور چھوٹے موٹے ننھے منے پیارے نیارے کھلونوں اور ان کے ساتھ کھیلوں کو دیکھتی ہوں تو مجھے تمہارا بچپنا یاد آتا ہے، تمہارا کھیلنا، کودنا، ہنسنا، خود سے باتیں کرنا اور مسکرانا، وہ ناز و نخرے سب یاد آتا ہے۔ میں چوپال اور کھلیان میں بکھری ہوئی بچپن کی یادوں کو دل میں سمیٹنے کے لئے جاتی ہوں۔ وہاں سب کچھ پاتی ہوں مگر --- تمہیں نہیں پاتی ہوں ---! میں نے تمہارے ان سب کھلونوں کو سنبھال کے رکھا ہے، مجھے پتہ ہے کہ آج ہماری نظروں میں ان کی کوئی اہمیت نہیں! مگر یہ کیا کہ جب ہم چھوٹے تھے تو تم ان کو حاصل کرنے کے لئے لڑ پڑتے تھے۔ بوجہ بے وجہ ہم ایک دوجے سے روٹھ جاتے تھے۔ تمہاری وہ گڑیا جس کو تم نے اپنی سہیلی بنا لیا تھا اور دن بھر تم اس کے بال سنوارتے رہتے تھے، اس سے باتیں کرتے تھے، اب میری طرح تنہا ہو گئی ہے! پتہ نہیں وہ تم سے اور تم اس سے کیسے باتیں کرتے تھے؟ کیا کیا باتیں کرتے تھے۔ میں نے بھی اپنی تنہائی کو کم کرنے اور تمہاری یادوں کے زخم

بھرنے کے لئے اس سے کئی بار بات کرنی چاہی مگر وہ تو کچھ بولتی ہی نہیں؛ شاید! وہ بھی تمہاری طرح مجھ سے روٹھی ہوئی ہے، مگر میں نے تو اس کو کبھی کچھ نہیں کہا پھر وہ مجھ سے کیوں روٹھی ہوئی ہے؟ میں نے مہدی کو بھی تمہاری طرح اللہ کی راہ۔۔۔! مجھے امید ہے کہ تم میرے اس فیصلے پہ راضی رہوگے۔

حالات روز بروز خراب تر ہوتے جارہے ہیں پتہ نہیں کب کیا ہو جائے! شاید ملاقات اب آخرت میں نصیب ہوگی!!!

خبرم رسید امشب کہ نگار خواہی آمد
سرِ من فِدائے راہی کہ سوار خواہی آمد
بہ لبم رسیدہ جانم، تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نمانم، بہ چہ کار خواہی آمد
منم و دلی و آہی رہ تو درونِ این دل
مرو ایمن اندر این رہ، کہ فگار خواہی آمد
ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بہ امید آنکہ روزی بشکار خواہی آمد
کششی کہ عشق دارد نگزاردت بدینساں
بہ جناہ گر نیائی، بمزار خواہی آمد
بہ یک آمدن ربودی دل و دین و جانِ خسرو
چہ شود اگر بدین ساں دوسہ بار خواہی آمد

والسلام، قربانِ شما: آسیہ عبدالہادی

15 رمضان المبارک 1414ھ

مہدی جب تھوڑا بڑا ہو گیا تو اڑوس پڑوس کے بچوں کے ساتھ دوستی کر کے ان کے گھر جانے لگا۔ وہاں عورتوں کو دیکھ کر ایک دن میری گود میں بیٹھ کر بڑے پیار سے میری ڈھاڑی میں ہاتھ پھیر کر معصومانہ انداز میں کہنے لگا:

"ابو میری امی کہاں ہے؟"

اُس کے اِس سوال نے میرے سارے وجود میں ہلچل مچادی، میں اس سے تلملا اٹھا۔ اس کا کیا جواب دیتا! میرے پاس تو اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اب اگر کوئی جواب دیتا بھی وہ بچے کو کس طرح سمجھاتا؟ مہدی نے بہت ضد کی:

"مجھے بتاؤ، مجھے بتاؤ، ابو مجھے بتاؤ میری امی کہاں ہے؟ میری امی، امی، امی!!! مجھے امی کے پاس جانا ہے! امی، مجھے امی کے پاس جانا ہے۔ میں ان کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہوں۔ کھیلنا چاہتا ہوں۔ حُضیر تو اپنی امی سے پیاری پیاری باتیں کرتا ہے۔ وہ ان کو گلے لگاتی ہے! مجھے بھی امی سے گلے ملنا ہے۔ امی سے گلے ملنا ہے۔ امی کو گلے لگانا ہے۔ گلے لگانا ہے۔ بتاؤ ابو بتاؤ نا۔ میری امی کہاں ہے؟ کہاں ہے ــــــ؟"

"مہد ــــــ ی، میرے لال تیری امی اللہ میاں کے پاس گئی ہے۔"

"اللہ میاں کے پاس! ۔۔۔۔

۔۔۔۔ اللہ میاں کے پاس کیا کرنے گئی ہے؟"

"اللہ میاں نے بلایا ہے!"

"تو مجھے بھی اللہ میاں کے پاس لے چلو؟"

اب دوسری بڑی مشکل پیدا ہو گئی تھی بچوں سے مات کھانا کوئی آسان کام نہیں۔

"اللہ میاں کے پاس ایسے ہی نہیں جاتے۔ جب اللہ میاں بلاتے ہیں تب ہی جاتے ہیں۔"

"پھر اللہ میاں ہمیں کب بلائیں گے؟ اللہ میاں سے کہو کہ ہمیں جلدی بلائے! میں امی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں کہہ دوں گا کہ: "اللہ میاں میرا پیارا مہدی تم سے ملنا چاہتا ہے، اپنی امی سے ملنا چاہتا ہے۔ اپنے دادا، دادی، بوا، چچا سے ملنا چاہتا ہے۔"

"ابو ـــ اللہ میاں نے ان کو کیوں بلایا اور ہمیں نہیں بلاتا؟"

مہدی میرے لئے مشکلوں پہ مشکلیں کھڑا کرتا جا رہا تھا۔ اب اس کا کیا جواب تھا؟

"ہم ابھی نماز کے لئے مسجد جائیں گے۔ وہاں اللہ میاں ملیں گے۔ ان سے وہیں پہ کہہ دینا، اللہ میاں ہمیں کب بلاؤ گے؟ ٹھیک ہے میرے لال، میرا پیارا بچہ، میرا پیارا مہدی۔ میں آپ کو اچھا سا فالودہ بنا کر دیتا ہوں۔ پھر ہم کھانا کھائیں گے، باغوں میں سیر کو جائیں گے۔ اب تو خوش؟"

بادلِ نخواستہ مہدی تیار ہو گیا۔ اس کے لئے میری طرح چارہ بھی کیا تھا۔ اس کے سب سوال تو جوابوں کے بغیر ہی پورے ہوتے تھے۔ وہ بھی تو ابھی سے لاحاصل تمناؤں کا شکار ہوا تھا۔ میں مہدی کو کیا کہتا کہ میں بھی تو آسیہ ـــ امی، ابو، بھائی، بہن اور

دوستوں کی کمی کو بہت محسوس کررہاہوں۔ آسیہ ـــــ ایسا کہاں سے لاؤں تجھ سا کہوں جسے؛ پھر مہدی کو دیدوں کہ وہ تسلی پائے؟!!!!!

کہاں پہ زاویہ بدلا، کہاں سے موڑ مڑ گیا؟

کہاں پہ تم رہ گئے، کہاں سے میں بچھڑ گیا؟

کدھر گئی وہ فرصتیں، مزے کہاں چلے گئے؟

انھیں کا انتظار ابھی پانوؤں جہاں اکھڑ گیا

آس اب بھی لگا بیٹھے تیرے آنے کی ہے ہم

اس ایک جلن سے میرا ہر ایک ارمان سڑ گیا

جہاں پہ آتے جاتے بارہا میں تیرا نام لکھتا تھا

اس درخت سے اب وہ آخری پتا بھی جھڑ گیا

جہاں پہ اپنا بچپنا، جوانیاں بتائیں تھیں

وہ گلیاں اب ویران ہیں اور گاؤ ں بھی اجڑ گیا

انتظار کا ہی آخر پڑاؤ-------

"آس——تم!!!——تم یہاں، آسیہ——تم!!!"تم---"کہاں کہاں ؟ چلی گئی تھی مجھے چھوڑ کر اس بیچ تپتے صحرا میں اکیلے جھلنے کے لئے، اتنی سنگدل کیوں کر بن گئی تھی ؟ تمھیں تو پتہ تھا کہ مجھے تمہاری کتنی ضرورت ہے۔ میں ہمیشہ تمہارے بغیر خود کو ادھورا محسوس کرتا ہوں۔

"ہاد——بچوں کی طرح رونے لگے ہو۔ تم ایسے بزدل کب سے بن گئے ؟"

"آس——روؤں نہیں تو اور کیا کروں؟ مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔ تم آگئی ہو؟"

"میں سنگدل کیسے بن سکتی ہوں؟ کیا میرے بارے میں تمھیں ایسا لگتا ہے کہ میں سنگدل بن سکتی ہوں؟ وہ آسیہ جسے تم پھول سا ملائم، تتلی سا نازک کہتے تھے۔ تمھیں میری ضرورت تھی، میں چلی آئی۔ تم بلاؤ میں نہ آؤں ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ جتنے گلے شکوے کرنے ہیں وہ سب کر لو! زندگی میں حسین راتیں کبھی کبھی ہی نصیب ہوتیں ہیں اور نصیب والے ہی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"آس ـــــ میرا وجود تمہارے بغیر نڈھال ہو چکا ہے۔ مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے، دلاسہ دینے کی حاجت ہے۔ تم نے ہی لکھا تھا کہ محبت کے سارے زخم ابھی تازہ ہیں ان زخموں پہ مرہم کی ضرورت ہے۔"

"ہاد ـــــ محبت کے زخم ہمیشہ ہرے رہتے ہیں۔ ان سے خون رِستا رہنا چاہیے۔ یہ زخم دنیا میں مندمل نہیں ہو سکتے۔ ان زخموں کا علاج دنیا میں نہیں ہے۔ جس سے یہ مندمل ہو سکیں۔ کیوں ان کو بھرنا چاہتے ہو؟ یہ اگر ٹھیک بھی ہو جائیں تو یادیں ان سے گوشت نوچ لیتی ہیں اور کھرچ کھرچ کر ان کو تازہ کرتیں ہیں۔۔۔"

"آسیہ ـــــ کیا تمھیں مہدی کی بھی یاد نہ آئی۔ وہ اکثر مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھتا ہے۔ میرے پاس اُس کے اِس بار بار کے سوال کا کوئی بھی جواب نہیں ہے۔ وہ تم سے کیسی شدید محبت کرتا ہے، میں اس پر حیران ہوتا ہوں۔"

"ہاد ـــــ اس کا جواب وہی ہے؛ جو تم نے مجھے دیا تھا۔ جب میں نے تم سے یہ سوال کیا تھا: "میرا کیا بنے گا"؟ تم نے کہا تھا: "اِس سوال کا جواب مجھ سے بہت سی مائیں، بہنیں، بیٹیاں پوچھتی ہیں۔" تو مجھ سے بھی آج مہدی جیسے کئی بچے پوچھتے ہیں، میں ان کو کیا جواب دوں؟ ہاد ـــــ یہ سب مقدر کے فیصلے ہیں ان پر راضی رہنا چاہیے۔ میں ان پر راضی ہوں۔ کیا تم نہیں ہو؟"

"کیوں نہیں مگر مہدی کو کیا سمجھائیں وہ تو ابھی بچہ ہے؟"

"وقت ہر زخم کا مرہم اور ہر غم کی دوا ہے۔ انسان دھیرے دھیرے خود کو اس کے ہر تقاضے کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ سب کچھ سمجھ جائے گا۔"

آس— اب مجھے چھوڑ کر تو نہ جاؤ گی ؟"

اس کا وعدہ میں نہیں کر سکتی !"

کیا مطلب ہے تمہارا ؟"

"انسان اختیار کے حد تک تو وعدہ کر سکتا ہے۔ اس سے زائد نہیں !"

یہ کہہ کر آسیہ — اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ گہری پلکوں کے سایے میں چھپی ہوئی پر نم آنکھوں سے آخری بار مجھے دیکھ کر چلی گئی۔ میں نے اس کو روکنا چاہا۔ وہ ہاتھ نہ آئی۔ میں آواز دیتا رہا:

آسیہ ——!، آآ سیہ ——!، آآآآ سیہ ——!

آس، آس، آسی ی ی ی ی ہ ی ہ ی ہ !ہ!!ہ!!ہ!!ہ!

مگر کوئی جواب نہ آیا۔~۔~۔~۔~۔~۔~۔~۔~~~~~~~

"ابا جانی! ابا جانی! کیا ہوا؟ آپ ٹھیک ہیں؟ آپ امی کو ایسی دلخراش آواز سے کیوں پکار رہے ہیں؟"

"آسیہ ————————————"

"ابی جان آپ رو رہے ہیں، یوں آنسو بہا رہے ہیں؟"

مہدی نے اپنے نرم و نازک ہاتھ میرے کاندھوں پہ رکھے۔ میں گویا ایک دم نیند سے جاگ گیا۔ میرا سہانا خواب ٹوٹ گیا۔ خوابوں اور خیالوں کی دنیا بھی کیسی عجیب ہوتی ہے۔ اس کی سب سے عجیب بات پائی کہ یہ انسان کو لمحوں میں صدیوں کا سفر طے کرواتی ہے۔ منزل کے قریب پہنچ کر انسان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ نیند ٹوٹ جاتی ہے،

توخواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ کنارے کے قریب پہنچ کر خیالات کے ہاتھ سے پتوار چھوٹتا ہے، تو نیّا واپس اپنے پہلے ہی کنارے پر ہوتی ہے۔ میں یادوں کی کن کن وادیوں سے لوٹ کر آیا۔ ماضی کی کتنی دنیاؤں کی سیر کر کے لوٹا، مگر جب آنکھ کھلی تو میں اپنے جلے ہوئے گھر کی راکھ میں لت پت ہو چکا تھا!

اک اک کر کے بجھ گئے امیدوں کے چراغ
انتظار کا آخری پڑاؤ بھی گزر گیا
لوٹ آئے ہم شکستہ پانوؤں، رنجیدہ دل
اپنے ارمانوں کی نعش بوسیدہ کندھوں پہ اٹھائے!

☆☆☆

مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا ﴿۲۳﴾ لِّیَجْزِیَ اللّٰهُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِهِمْ وَیُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۲۴﴾ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِغَیْظِهِمْ لَمْ یَنَالُوْا خَیْرًا ؕ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ الْقِتَالَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِیًّا عَزِیْزًا ﴿۲۵﴾ وَاَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ

آس— اب مجھے چھوڑ کر تو نہ جاؤ گی؟"

اس کا وعدہ میں نہیں کر سکتی!"

کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"انسان اختیار کے حد تک تو وعدہ کر سکتا ہے۔ اس سے زائد نہیں!"

یہ کہہ کر آسیہ —— اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ گہری پلکوں کے سایے میں چھپی ہوئی پر نم آنکھوں سے آخری بار مجھے دیکھ کر چلی گئی۔ میں نے اس کو روکنا چاہا۔ وہ ہاتھ نہ آئی۔ میں آواز دیتا رہا:

آسیہ ——!، آآ سیہ ——!، آآآآ سیہ ——!

آس، آنس، آسی ی ی ی ی ہ ی ہ ی ہ !ہ!!ہ!!ہ!!ہ!

مگر کوئی جواب نہ آیا۔~۔~۔~۔~۔~۔~۔~۔

"ابا جانی! ابا جانی! کیا ہوا؟ آپ ٹھیک ہیں؟ آپ امی کو ایسی دلخراش آواز سے کیوں پکار رہے ہیں؟"

"آسیہ ——————————"

"ابی جان آپ رو رہے ہیں، یوں آنسو بہا رہے ہیں؟"

مہدی نے اپنے نرم و نازک ہاتھ میرے کاندھوں پہ رکھے۔ میں گویا ایک دم نیند سے جاگ گیا۔ میرا سہانا خواب ٹوٹ گیا۔ خوابوں اور خیالوں کی دنیا بھی کیسی عجیب ہوتی ہے۔ اس کی سب سے عجیب بات پائی کہ یہ انسان کو لمحوں میں صدیوں کا سفر طے کرواتی ہے۔ منزل کے قریب پہنچ کر انسان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ نیند ٹوٹ جاتی ہے،

توخواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ کنارے کے قریب پہنچ کر خیالات کے ہاتھ سے پتوار چھوٹتا ہے، تو نیّا واپس اپنے پہلے ہی کنارے پر ہوتی ہے۔ میں یادوں کی کن کن وادیوں سے لوٹ کر آیا۔ ماضی کی کتنی دنیاؤں کی سیر کر کے لوٹا، مگر جب آنکھ کھلی تو میں اپنے جلے ہوئے گھر کی راکھ میں لت پت ہو چکا تھا!

اک اک کر کے بجھ گئے امیدوں کے چراغ

انتظار کا آخری پڑاؤ بھی گزر گیا

لوٹ آئے ہم شکستہ پانوؤں، رنجیدہ دل

اپنے ارمانوں کی نعش بوسیدہ کندھوں پہ اٹھائے!

☆☆☆

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۴﴾ ۚ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿۲۵﴾ ۚ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ

صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا ﴿٢٦﴾ وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿٢٧﴾ (الاحزاب)

ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے۔ پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعضے ان میں مشتاق ہیں اور انھوں نے ذرا تغیر و تبدیل نہیں کیا۔ یہ واقعہ اس لئے ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے سچ کا صلہ دے اور منافقوں کو چاہے سزا دے یا چاہے ان کو توبہ کی توفیق دے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ان کے غصہ میں بھرا ہوا ہٹا دیا کہ ان کی کچھ مراد بھی پوری نہ ہوئی اور جنگ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے آپ ہی کافی ہو گیا اور اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا زبردست ہے۔ اور جن اہل کتاب نے ان کی مدد کی تھی ان کو ان کے قلعوں سے نیچے اتار دیا اور ان کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھا دیا بعض کو تم قتل کرنے لگے اور بعض کو قید کر لیا۔ اور ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا تم کو مالک بنا دیا اور (ایسی زمین کا بھی) جس پر تم نے قدم نہیں رکھا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

ترجمہ از حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ

سب کہاں، کچھ، لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی، جو پنہاں ہو گئیں

☆☆☆

فرہنگ

ناول میں استعمال کئے گئے کشمیری الفاظ کے معنی:

بانٹھِ تہِ سنگتر مِٹھائے: کنیچے اور سنگترے جیسی مٹھائی۔

ببری ترٹش: ببر، سرسوں کے دانوں جیسے بیج ہوتے ہیں۔ ترٹش: پانی، ان دانوں کو پانی اور دودھ میں شکر کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ زیادہ استعمال رمضان المبارک میں کیا جاتا ہے۔

برم رم چوک: ایک فرضی جن ہے۔ اس کی خاصیت ہے کہ یہ انسانوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ آدمی تو وہی رہتا ہے مگر اس کے عادات واطوار بدل جاتے ہیں۔

پھیرن: گرم کپڑا جو قمیص کی طرح ہی سلا جاتا ہے، مگر کھلا ڈھلا۔ اس کی مخصوص پہچان یہ ہوتی ہے کہ ہاتھ اس کے اندر رکھے جاتے ہیں اس لئے اس کے بازو باہر لٹک رہے ہوتے ہیں۔ پہلی بار دیکھنے والے محسوس کرتے ہیں کہ شاید ہاتھ کاٹ دیے گئے ہیں۔

تاپی سحر: آفتاب نکلنے کے بعد کی سحری۔ (یہ بڑے بچوں سے مزاقیہ کہتے ہیں۔)

تصرف دار: یہ بھی بھوت یا جن ہے، اکثر اس کا ورود رات کو ہوتا ہے۔ یعنی جناتی مخلوق آدمی میں تصرف کر جاتی ہے۔

مِنہِ کلہ: گنجا

صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا ﴿٢٦﴾ وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿٢٧﴾ (الاحزاب)

ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے۔ پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعضے ان میں مشتاق ہیں اور انھوں نے ذرا تغیر و تبدیل نہیں کیا۔ یہ واقعہ اس لئے ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے سچ کا صلہ دے اور منافقوں کو چاہے سزا دے یا چاہے ان کو توبہ کی توفیق دے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ان کے غصہ میں بھرا ہوا ہٹا دیا کہ ان کی کچھ مراد بھی پوری نہ ہوئی اور جنگ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے آپ ہی کافی ہو گیا اور اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا زبردست ہے۔ اور جن اہل کتاب نے ان کی مدد کی تھی ان کو ان کے قلعوں سے نیچے اتار دیا اور ان کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھا دیا بعض کو تم قتل کرنے لگے اور بعض کو قید کر لیا۔ اور ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا تم کو مالک بنا دیا اور (ایسی زمین کا بھی) جس پر تم نے قدم نہیں رکھا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

ترجمہ از حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

سب کہاں، کچھ، لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی، جو پنہاں ہو گئیں

☆☆☆

فرہنگ

ناول میں استعمال کئے گئے کشمیری الفاظ کے معنی:

بانٹہٕ تیہٕ سنگتر مِٹھائے: کنچے اور سنگترے جیسی مٹھائی۔

ببری ترکش: ببر، سرسوں کے دانوں جیسے بیج ہوتے ہیں۔ ترکش: پانی، ان دانوں کو پانی اور دودھ میں شکر کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ زیادہ استعمال رمضان المبارک میں کیا جاتا ہے۔

برم رم چوک: ایک فرضی جن ہے۔ اس کی خاصیت ہے کہ یہ انسانوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ آدمی تو وہی رہتا ہے مگر اس کے عادات واطوار بدل جاتے ہیں۔

پھیرن: گرم کپڑا جو قمیص کی طرح ہی سلا جاتا ہے، مگر کھلا ڈھلا۔ اس کی مخصوص پہچان یہ ہوتی ہے کہ ہاتھ اس کے اندر رکھے جاتے ہیں اس لئے اس کے بازو باہر لٹک رہے ہوتے ہیں۔ پہلی بار دیکھنے والے محسوس کرتے ہیں کہ شاید ہاتھ کاٹ دیے گئے ہیں۔

تاپی سحر: آفتاب نکلنے کے بعد کی سحری۔ (یہ بڑے بچوں سے مزاقیہ کہتے ہیں۔)

تصرف دار: یہ بھی بھوت یا جن ہے، اکثر اس کا وارودرات کو ہوتا ہے۔ یعنی جناتی مخلوق آدمی میں تصرف کر جاتی ہے۔

مِنہٕ کلہ: گنجا

صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا ﴿٢٦﴾ وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿٢٧﴾ (الاحزاب)

ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے۔ پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعضے ان میں مشتاق ہیں اور انھوں نے ذرا تغیر و تبدیل نہیں کیا۔ یہ واقعہ اس لئے ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے سچ کا صلہ دے اور منافقوں کو چاہے سزا دے یا چاہے ان کو توبہ کی توفیق دے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ان کے غصہ میں بھرا ہوا ہٹا دیا کہ ان کی کچھ مراد بھی پوری نہ ہوئی اور جنگ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے آپ ہی کافی ہو گیا اور اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا زبردست ہے۔ اور جن اہل کتاب نے ان کی مدد کی تھی ان کو ان کے قلعوں سے نیچے اتار دیا اور ان کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھا دیا بعض کو تم قتل کرنے لگے اور بعض کو قید کر لیا۔ اور ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا تم کو مالک بنا دیا اور (ایسی زمین کا بھی) جس پر تم نے قدم نہیں رکھا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

ترجمہ از حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ

سب کہاں، کچھ، لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی، جو پنہاں ہو گئیں

☆☆☆

فرہنگ

ناول میں استعمال کئے گئے کشمیری الفاظ کے معنی:

بانٹہِ تۂہ سنگترمِٹھاے: کنچے اور سنگترے جیسی مٹھائی۔

ببری ترٹش: ببر، سرسوں کے دانوں جیسے بیج ہوتے ہیں۔ ترٹش: پانی، ان دانوں کو پانی اور دودھ میں شکر کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ زیادہ استعمال رمضان المبارک میں کیا جاتا ہے۔

برم رم چوک: ایک فرضی جن ہے۔ اس کی خاصیت ہے کہ یہ انسانوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ آدمی تو وہی رہتا ہے مگر اس کے عادات واطوار بدل جاتے ہیں۔

پھیرن: گرم کپڑا جو قمیص کی طرح ہی سلا جاتا ہے، مگر کھلا ڈھلا۔ اس کی مخصوص پہچان یہ ہوتی ہے کہ ہاتھ اس کے اندر رکھے جاتے ہیں اس لئے اس کے بازو باہر لٹک رہے ہوتے ہیں۔ پہلی بار دیکھنے والے محسوس کرتے ہیں کہ شاید ہاتھ کاٹ دیے گئے ہیں۔

تاپی سحر: آفتاب نکلنے کے بعد کی سحری۔ (یہ بڑے بچوں سے مزاقیہ کہتے ہیں۔)

تصرف دار: یہ بھی بھوت یا جن ہے، اکثر اس کا وروود رات کو ہوتا ہے۔ یعنی جناتی مخلوق آدمی میں تصرف کر جاتی ہے۔

ٹِنہِ کلہ: گنجا

ٹینچہِ: پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، جن سے ایک کھیل کھیلا جاتا ہے۔

حاج دراے بیت اُللہ: حاجی اللہ کے گھر کی طرف چلے۔

چھونبُن: دھان یا فصلوں کی چھمائی۔

دپہنہ: شادیوں پر دعوت دینے کو کہتے ہیں۔

رُوز دارس ثواب ساس، دوٗہل کھاوٗس لوری ٹاس: روزہ دار کے لئے ہزار ثواب اور بے روزہ کے لئے ہزار مار۔

سال: شادی اور تقریبات کے موقعوں پر کھانے کو کہتے ہیں۔

سزِلونگ: ہاپوٹاپو / اتی پتی کا کھیل جس میں ایک پیر پر پھد کنا پڑتا ہے۔

سوے: ایک قسم کی گھاس جس میں بہت باریک سُوئیاں ہوتی ہیں۔ جب اس کو جسم پر لگاتے ہیں تو سارے جسم پر پھوڑے نکلتے ہیں۔

شِشُر گانٹھ: برف کی شیشیوں جیسی راڑھیں، جو منفی درجہ حرارت کی وجہ سے عمارات کی چھتوں، پرالی یا درختوں پر برف کے منجمد ہونی کی وجہ سے بنتی ہیں۔

شنۂ ڈائن: ڈائن جو برف پڑنے کے بعد نکلتی ہے۔

شِنہِ مونیو: برف کا مجسمہ / کاٹون۔

عید آیہ رسہِ رسہِ عید گاہ وسہِ وو عید گاہ وسہِ وو:

عید چپکے چپکے آئی، چلو عید گاہ چلیں۔

نماز پُری تھِہِ تمے اندِ وسہِ وو تمے اندِ وسہِ وو:

نماز پڑھ کے اسی طرف سے چلیں۔

یمے اندِ نبی صاب تمے اندِ وسہِ وو تمے اندِ وسہِ وو:

جس طرف حضرت نبی اکرم ﷺ ہیں اسی طرف سے چلیں۔

اسی طرح باقی مصرعوں کے معنی ہیں قران پڑھ کے، ذکر کر کے، دعا مانگ کے اور جس طرف سعید صاحب، مخدوم صاحب، ریشی صاحب رحمہم اللہ ہیں اسی طرف سے چلیں۔

کاشُر باتھ: کشمیری گانا۔

کانگرِ: کانگڑی، آگ کے انگارے رکھنے ولا ایک پینڈا جس کو پھیرَن کے اندر رکھ کر خود کو گرم کرتے ہیں۔

کِرتر: اتی پتی کا کھیل کھیلنے کا پتھر یا پینڈے کا ایک ٹکڑا یا تلی۔

کیاہ بنیو ووَنی سمسارو۔۔۔ الوداع سانے یارو: "اب زمانے نے کیسا رنگ دکھا دیا۔۔۔ اے ہمارے دوستو الوداع۔" مشہور نوحہ جو عظیم ہستیوں کی موت کے موقعے پر بڑے ہی پر تاثیر انداز میں ان کا جنازہ لیتے ہوئے دہرایا جاتا ہے۔

گاسہِ بنہِ: پرالی، چھمائی کے بعد گھاس کے ڈھیر کو کہتے ہیں۔

گونی: پولا / پولی فصلوں کے ڈھیر بالخصوص دھان کی فصل کو گول طریقے پر جمع کرنے کو کہتے ہیں۔

لپٹن چائے: شکر والی یا میٹھی چائے۔ لپٹن دراصل ایک کمپنی تھی جس نے یہاں اس چائے کا رواج چلایا اسی وجہ سے اب میٹھی چائے کو یہاں لپٹن چائے ہی کہتے ہیں۔

لڈی شاہ: کشمیری منظوم مزاحیہ صنف، اس کا گائک کار (جو لڈی شاہ کہلاتا ہے) ہاتھ میں چمٹے کے مشابہ ایک آلہ بجا کر مزاحیہ کلام کو اپنے مخصوص انداز میں گاتا ہے۔ لڑی شاہ زیادہ تر فصلیں کاٹنے کے موسم میں نمودار ہوتے تھے اور اپنا مزاحیہ کلام سنا کے دھان کی صورت میں خراج وصول کرتے تھے۔

نوٹ: "لڈی شاہ بوزِناوِ از گرک حال": لڈی شاہ آج گھر کا حال سنائے گا۔ یہ پہلے شعر کا دوسرا اور بقیہ کا چوتھا مصرع ہے۔ جس کی تکرار ہوتی ہے اس لئے آگے اس کا معنی نہیں لکھا جائے گا۔ کتاب میں شامل پورے لڈی شاہ کا معنی یوں ہے:

1. کیا بوڑھے، کیا جوان سب کو مار پڑی۔ لڈی شاہ آج گھر کا حال سنائے گا۔
2. ہمیں اپنے ہی گھروں میں قید کیا گیا، مظلوم کو فسادی اور ظالموں کو امن پسند کہا گیا۔ کون سنے کہ ہر روز ہڑتال کیوں ہوتا ہے۔
3. یتیموں اور بیواؤں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ظالموں کے ظلم کی وجہ سے جو یہاں دن رات ہے۔ یہاں انسانی خون کو پامال کیا گیا۔
4. مجونٹوں (انتہائی بے وقوفوں) نے اپنا دین و ایمان بیچا۔ بیچارے کشمیریوں کی (موت کا) طوفان برپا کیا۔ ان کے محافظوں کو کوڑیوں کے عوض مروایا۔
5. گلستان میں بریک ڈاون کر کے۔ چمن کو ایک آن میں ویران کیا۔ وہاں کے گل مرجھا گئے اب بھیڑیے اونگھ رہے ہیں۔

6. مسلمان کے لئے قیامت (یعنی آخرت) سب سے بڑی تسلی (اطمینان کا مقام)

ہے۔ صبر کرنا یہاں سیدھا راستہ ہے۔ ظالموں کو جہنم کا جال لپیٹے گا۔

7. کتنے سکندر، قلندر حیران ہیں۔ سب کے دل میں بہار کا ارمان ہے۔ بھائی سچ ہے

ہمارے اعمال بد ہیں۔ لڈی شاہ آج گھر کا حال سنائے گا۔

مرژِواَنگن بڈ: مرچ کی بوڑھیا۔ یہ ایک فرضی ڈائن ہے جو بڑوں نے اس لئے گھڑی تھی تاکہ بچے کیاریوں میں چوری نہ کریں۔

نُنہ چاے: کشمیری نمکین چاے۔

نیندِ: نلائی، دھان کے کھیتوں کو خودرو نباتات سے صاف کرنا۔

نیندِ باتھ: باتھ کے معنی گیت کے ہیں۔ اس کام کے دوران جو گیت گائے جاتے ہیں انہی گیتوں کو نیندِ باتھ کہتے ہیں۔

وُرِ: شادیوں یا تقریبات کے موقعوں پر کھانا بنانے کی جگہ۔

یِمو وَلو: آنکھ مچولا / مچولی، اس کھیل میں کسی عمارت، پولی یا پرالی کی آڑ میں چھپتے ہیں۔ ایک ساتھی آنکھیں بند کئے ہوئے "یِمو" یعنی کیا میں آؤں پکارتا ہے اور باقی "وَلو" یعنی آجاؤ کہتے ہیں۔ پھر وہ جس کو پکڑے گا، اسی بھی یہی عمل دہرانا پڑتا ہے۔

فارسی غزل:

1. میرے محبوب مجھے خبر ملی ہے کہ آج تم آو گے۔ میرا سر اس راستے پر نچھاور ہے جس راستے سے تم سوار ہو کر آؤ گے۔

2. میرے محبوب میری جان لبوں پر آگئی ہے۔ اب تو آجا کہ میں بچ سکوں۔۔ زندہ رہ سکوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تو آئے گا۔ میرے مرنے کے بعد آئے گا۔ لیکن یہ آنا کیا آنا ہے!

3. میں، میرا ایک دل، اس کی آہ اور اس دل میں راستہ ہے۔ اس راستے پر بے فکر ہو کر نہ چلیے کہ بے بس ہو کر آجاؤ گے۔

4. جنگل کی تمام ہرنیں اپنے سر خود ہتھیلی میں لئے اس امید پر رکھ بیٹھی ہیں کہ آپ اس طرف کسی دن شکار کرنے کے لئے آجائیں گے۔

5. عشق کی یہ کشش ایک ایسی کشش ہے جو تمہیں اسی طرح مجھ سے دور نہیں رہنے دے گی۔ جنازے پر نہ سہی۔۔ نہ سہی قبر پر تو ضرور آؤ گے۔

6. میرے محبوب تو ایک ہی بار آکر خسرو کا (میرا) دل، دین اور جان چھین کر لے گیا۔ اگر تو دو تین اسی طرح آئے تو نہ جانے کیا ہو۔

کلام شعرائے کرام:

اساتذۂ شعرا حضرت امیر خسرو، استاتذہ الاساتذہ حضرت غالب، مرشدِ من حضرت اقبال، مکرمین مخدوم محی الدین، وزیر آغا، سکندر ارشاد، اور راقم۔

مصنف کا تعارف

عبداللہ امتیاز احمد : اسسٹنٹ پروفیسر، ہائر ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ، جموں وکشمیر۔

تعلیم : پی ایچ ڈی (جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی)

ایم۔اے۔اردو (دانشگاہِ کشمیر)

ایم۔اے۔انگریزی (اگنو)

بی۔ایڈ۔(دانشگاہِ کشمیر) عربی لسانیات، بنیادی فارسی قواعد

تصانیف : 1۔عالمی بیانیہ اور مسلم الجھن (مسلمانوں کے مسائل کا فلسفیانہ تدارک)

2۔ادب اور فکری مغالطے (ادب میں رائج شیطانی متن کی ترسیم وتخریج)

3۔ادب اور تذکیریت (تانیثیت کے پروپیگنڈے کا تجزیہ)

4۔صورِ سرافیل (کلامِ اقبال کی اصل جہت)

5-Treatise on Philosophy (English)

اس میں زبان، تفہیم اور استدلال کے طریقِ کار پر بحث کی گئی ہے۔

6۔ہیروں کی تلاش (خاکے)

7۔دلیل: کہانی ہم سب کی (ناول)

https://play.google.com/store/apps/details?id=org.book

8۔سوچ کا مجرم (کہانیوں کا مجموعہ)

https://play.google.com/store/apps/details?id=ebook.mujrim

9۔لنگوامیتھامیٹکا (زبان ماڈل)

ترتیب : 10۔مطالعہ اردو (ایم آئی ایل بی اے بی کام سال اول کے
طلبہ کے لئے کلسٹر یونیورسٹی کی منظور شدہ کتاب معاون مصنف زاہد ظفر)

11۔اردو نظم (ایم اے سال اول کے لئے فاصلاتی نظامِ تعلیم
کشمیر یونیورسٹی کی منظور شدہ، معاون مصنف ڈاکٹر عرفان عالم)

مقالے : دو درجن سے زائد تحقیقی وتنقیدی مقالے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

مختلف موضوعات پر کئی روزناموں، ہفتہ واروں اور ویب گاہوں پر مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

مسکن: پاہو، پلوامہ کشمیر۔

ای میل : tamana866@gmail.com ٹویٹر :Twitter: @MImtiyazA

Daleel - Kahani Hum Sab Ki
by Abdullah Imteyaz Ahmad

arshia publications
A for Arshia Publications
arshiapublicationspvt@gmail.com
ISBN 93-89455-58-8
9 789389 455588
+91 9971-77-5969
www.arshiapublications.com

arshiapublicationspvt@gmail.com